ماہنامہ

فکرِ نو

علی گڑھ

اکتوبر ۲۰۱۹ء



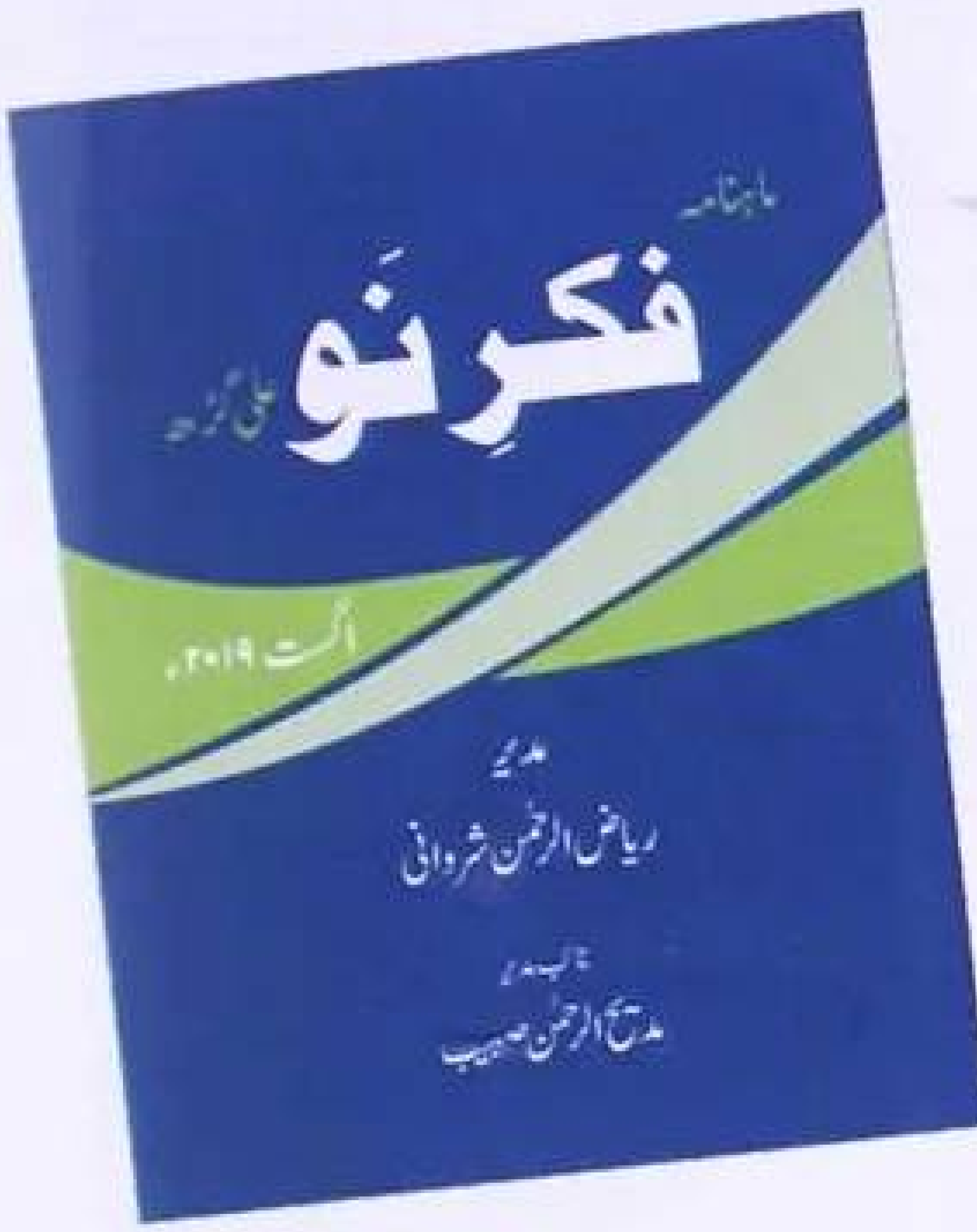
مدیر

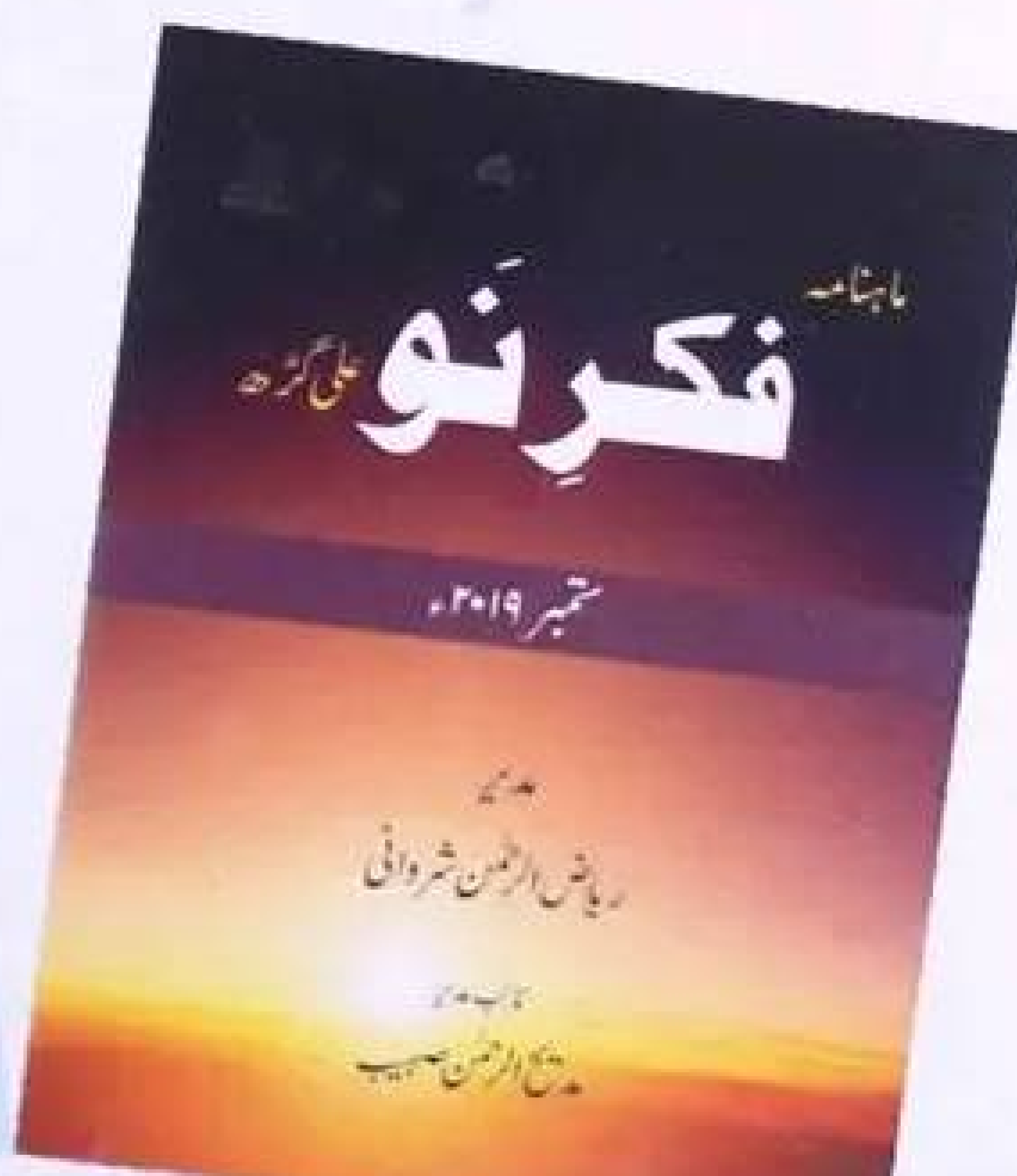
ریاض الرحمٰن شروانی

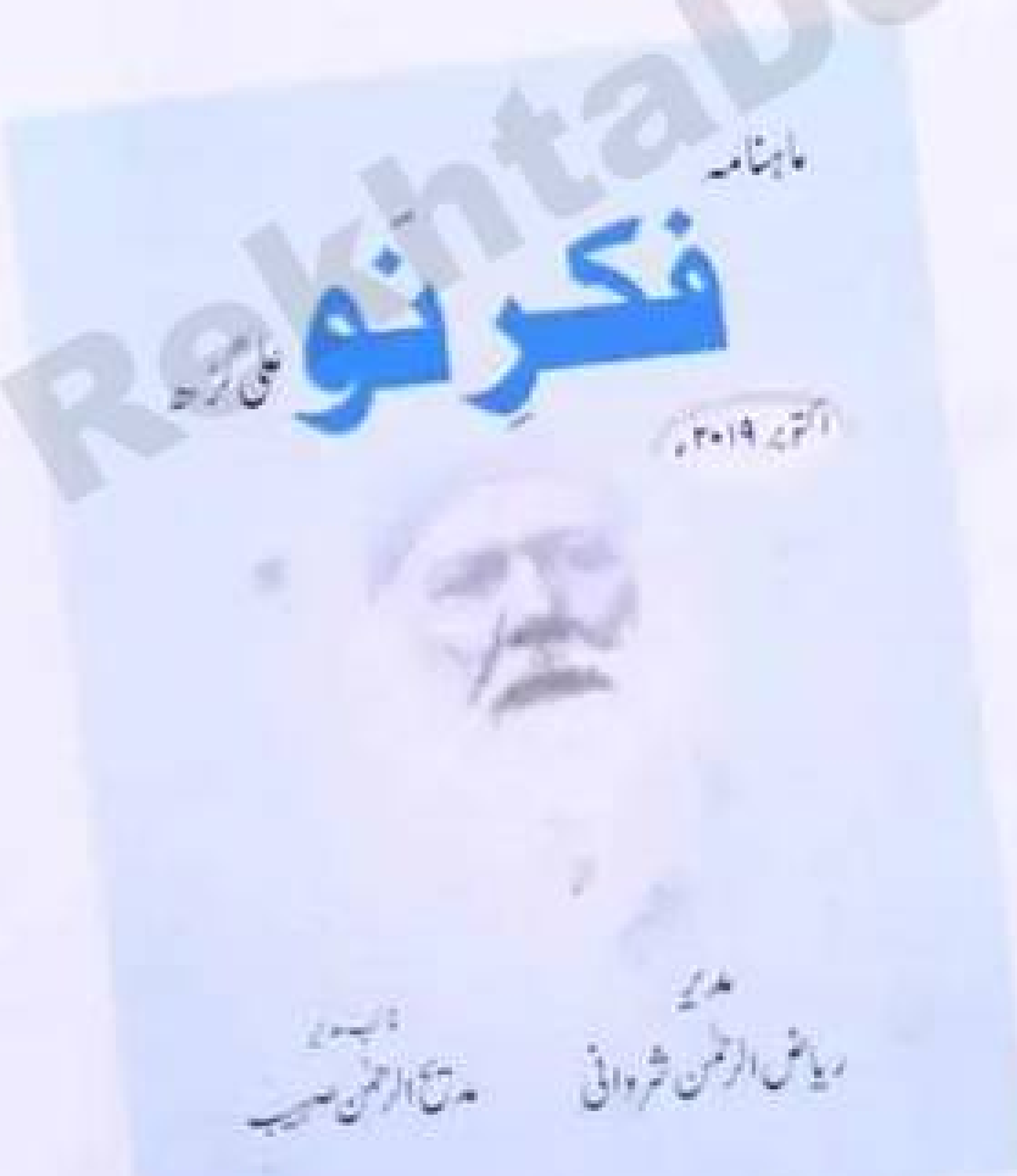
نائب مدیر

مدیح الرحمٰن صہیب


ماہنامہ
فکرِ نو
علی گڑھ
جولائی ۲۰۱۹ء
مدیر
ریاض الرحمٰن شروانی


ماہنامہ
فکرِ نو
علی گڑھ
اگست ۲۰۱۹ء
مدیر
ریاض الرحمٰن شروانی
نائب مدیر
مدیح الرحمٰن صہیب


ماہنامہ
فکرِ نو
علی گڑھ
ستمبر ۲۰۱۹ء
مدیر
ریاض الرحمٰن شروانی
نائب مدیر
مدیح الرحمٰن صہیب


ماہنامہ
فکرِ نو
علی گڑھ
اکتوبر ۲۰۱۹ء
مدیر
ریاض الرحمٰن شروانی
نائب مدیر
مدیح الرحمٰن صہیب

ماہنامہ

فکرِ نو

علی گڑھ

جلد: ۳ | اکتوبر ۲۰۱۹ء | شمارہ: ۳

قیمت فی شمارہ: ۲۵ روپے
قیمت سالانہ: ۲۵۰ روپے

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ:
Dr. Madihur Rahman Sohaib
Habib Manzil,Marris Road,Aligarh-202002 (U.P.)
fikrenaualigarh@gmail.com
+91 9897261978/9818897975

براؤن بک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، علی گڑھ

فہرست

نوٹ:- مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ہر تحریر کی اخلاقی وقانونی ذمہ داری کو پیش نظر رکھیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ کاپی رائٹ سے وابستہ کسی اصول کی قانون شکنی نہ ہو۔ ادارے کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ (مدیر)

اداریہ

جدید ذہن

ریاض الرحمٰن شروانی

اکتوبر سرسید احمد خاں کا مہینہ ہے۔ وہ اس مہینے کی ۱۷ر تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔ اس مناسبت سے اگر ایک سوال نامہ جاری کیا جائے جس میں دریافت کیا جائے کہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ کیا تھا تو ہمارے خیال میں، بیشتر افراد جواب دیں گے کہ وہ ایم اے او کالج تھا لیکن ہم اس رائے سے پوری طرح متفق نہیں ہیں۔

ہماری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ اُن کے سارے کام ایک منصوبے کے تحت انجام پائے۔ تفسیر قرآن ہو، سائنٹفک سوسائٹی ہو، ایم اے او کالج ہو یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سب کا مقصد ایک تھا۔ وہ مقصد تھا مسلمانان ہند میں بیداری پیدا کرنا، انھیں وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنا سکھانا۔ مغرب سے جو انقلاب آیا تھا اُس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا اور اُس کے قدم سے قدم ملا کر ساتھ ساتھ چلنا سکھانا۔ اسی کا نام جدید ذہن ہے۔ یعنی ایسا ذہن جو ماضی سے نہ چمٹا رہے بلکہ اُس میں آگے کی طرف دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ سرسید مسلمان تھے اور وہ جو ادارہ قائم کر رہے تھے وہ بیشتر مسلمانوں کے لئے تھا۔ اس کا انھیں پورا احساس تھا۔ اس لیے وہاں قدرتی طور پر دینی تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے تھا وہ ہوا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ سرسید اُس وقت کے قائم شدہ مدارس میں ایک مدرسے کا اضافہ کر رہے تھے۔ ان کا منشا تھا کہ جو علوم وفنون مغرب سے آئے ہیں انھیں حاصل کیا جائے اور ان میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ سرسید کے خیالات اور اُن کے اعمال کی شدید مخالفت ہوئی۔ سرسید مردِ دانا و بینا تھے۔ اُن کے اعصاب مضبوط تھے اس لیے انھوں نے مخالفتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ ان کے کارنامے کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ صرف اُن حضرات کی اولاد جو سرسید کے مخالف تھے آج ان کے ادارے میں تعلیم پا رہی ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو خود مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں آج اپنے بچوں کو مدرسوں میں نہیں بلکہ یونیورسٹیوں میں تعلیم دلا رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ سرسید کو ایسے جانشیں نہیں ملے، جو سرسید کے تعلیمی اور تہذیبی منصوبے کی پوری تکمیل کر سکتے۔ ورنہ یہ ادارہ اس سے کہیں بہتر حالت میں ہوتا جس حالت میں اب ہے۔ درمیان میں چند لوگ آئے جنھوں نے اس طرح کی کوشش کی لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی اور وہ طویل وقفوں کے بعد آئے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ آج بھی سرسید کی طرح سے سوچنے والے اس ادارے میں کتنے ہیں۔ چونکہ یہاں سے آج تک سرسید کی تفسیر القرآن اور تبیین الکلام کا دوسرا ایڈیشن شائع

نہیں ہوا ہے۔ سر سید کا صد سالہ یوم پیدائش آیا اور گذر گیا لیکن یہ بات زیر بحث ہی رہی کہ اُن کتابوں کی جدید اشاعت ہونی چاہیے یا نہیں ۔ یونیورسٹی کا مطلب ہے ذہنوں میں آفاقیت پیدا ہو، لیکن اگر وہی ذہن تنگ نظری کا شکار ہو جائے گا تو کیسے کام چلے گا۔

آج سر سید کی وفات کو ایک سو سے زیادہ برس ہو گئے ۔ اس مدت میں دُنیا ایک جگہ قائم نہیں رہی ہے۔ خصوصاً ۲۰ ویں صدی تو تبدیلیوں کی صدی رہی ہے اس میں بڑی جنگیں ہوئیں۔ ایشیا اور افریقہ کے تمام ملک آزاد ہوئے ، اشتراکیت نمودار ہوئی۔ یہ سب تبدیلیوں کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن ہم چند قدم بھی آگے نہیں بڑھے ہیں۔ سر سید نے ہمیں آگے کی طرف دیکھنا سکھلایا تھا۔ انھوں نے ہمیں زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں انھوں نے ہمیں چھوڑا تھا۔ اُس سے آگے بڑھنے کی ذرّہ برابر کوشش نہیں کی۔ سر سید تقلید بے جا کے خلاف تھے۔ ہم خود اُن کی تقلید سے آگے سوچنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

سر سید حد بندیوں کے خلاف تھے وہ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن انھوں نے اپنا ادارہ علی گڑھ میں قائم کیا تھا۔ پھر بھی آپ اُن کی تحریروں کا مطالعہ کریں آپ کو کہیں بھی دہلی اور علی گڑھ نظر نہیں آئے گا بلکہ آپ کے سامنے اگر پوری دنیا نہیں تو کم از کم پورا برصغیر ضرور کھلا ہوا نظر آئے گا۔ ہم ابھی تک حد بندیوں کے اسیر ہیں۔ ان حالات میں ہمیں اپنے کو سر سید کا نام لیوا کہنے کا کیا حق حاصل ہے؟

یہ اکثر ہوتا آیا ہے کہ جو لوگ جس کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دراصل اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ حالی کا مصرعہ ہے:

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم   (نبی کریم کا ارشاد ہے)

لیکن ہم نے آپ کی امت کے مظلوموں کی قبروں کو صنم بنا ڈالا ہے۔

دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے بھی یہی سب کچھ کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ یہ اس شخص کی پیروی نہیں ہوتی ہے جس کا ہم دم بھرتے ہیں۔ بلکہ اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ جب سر سید تقلید بے جا کے خلاف تھے تو خود ان کی بے جا تقلید کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ تحقیق حق کی تلاش کا نام ہے اور اس کی بنیاد شک پر ہوتی ہے مگر ہم پہلے سے ہی سوچ کر بیٹھے ہیں کہ ہمیں کسی کا دفاع کرنا ہے تو پھر وہ تحقیق کہاں رہی۔

خاص طور سے سر سید جیسے حق کے متلاشی کے ساتھ یہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ کھلے دل سے ان پر کام کرنا چاہیے۔ یہ ان کی عظمت کی نفی نہیں ہوگی بلکہ اس کا اثبات ہوگا۔

آثار الصنادید

(سرسید کی فکر وفہم کا اہم سنگ میل)

افتخار عالم خاں

سرسید کی ابتدائی تصانیف میں آثار الصنادید ایک اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ یہ کیوں اتنی اہم تصنیف ہے؟ اور سرسید کو آثار جیسی اہم کتاب لکھنے کی ترغیب کب اور کہاں سے ملی تھی؟ نیز سرسید کی فکر وفہم کے ارتقا میں اس کتاب کی کیا اہمیت ہے؟ زیر نظر مضمون میں انھیں نکات کی تشریح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

۔آثار الصنادید (۱۸۴۷ء) کی تصنیف کے پس پردہ جو بھی عوامل موجود رہے ہوں لیکن ان میں حاکم وقت کی نظروں میں سرخروی حاصل کرنے کی فطری اور جائز خواہش کا پرتو بھی صاف نظر آتا ہے۔ سرسید اپنی ملازمت کے دوران تقریباً چار سال آگرہ کمشنر کے آفس میں بطور نائب منشی اور بعد میں ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۵ء تک فتح پور سیکری میں بطور منصف متعین رہے تھے۔ آگرہ اور فتح پور سیکری میں باکثرت تاریخی عمارتیں موجود تھیں۔ انگریز افسران ان تاریخی عمارتوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کے متمنی رہتے ہوں گے اور اکثر اپنے ماتحتوں سے سوال بھی کرتے ہوں گے۔ ان کے اس تجسس کی تشفی کے لیے ان کے عملہ کے لوگ ان عمارتوں کے سلسلے کی اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہوں گے تا کہ اپنے افسران اور ان کے شناساؤں کے اس تجسس کا تسلی بخش ازالہ کرواسکیں۔ اسی وجہ سے یہ قطعی قرین قیاس ہے کہ آگرہ اور فتح پور سیکری میں قیام کے دوران سرسید نے بھی ان عمارتوں کے متعلق حتی الامکان اطلاعات حاصل کرنے کی کوششیں کی ہوں گی تا کہ اپنے انگریز افسران اور دیگر انگریز شناساؤں کے تجسس اور استفسارات کے تسلی بخش جوابات فراہم کرواسکیں۔ بہر حال ہمارے معروضہ کے مطابق ''آثار الصنادید'' کی تخلیقی تحریک کے پس پردہ، سرسید کے آگرہ اور فتح پور سیکری میں گزارے گئے آٹھ سالوں کے تجربات اور مشاہدات ضرور کارفرما رہے ہوں گے۔

سرسید کا ۱۸۴۵ء میں فتح پور سیکری سے دہلی تبادلہ ہوگیا تھا ۔اس وقت تک دہلی میں پرانی عمارتوں کی بازیافت اور ان کی دیکھ ریکھ کے سلسلے کا ابتدائی شعور پیدا ہو چلا تھا۔ دہلی کالج میں مسٹر بوٹروز، پرنسپل کے بطور موجود تھے۔ انھوں نے ۱۸۴۱ء میں ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی اور زور شور سے کتابوں کے ترجمے کروانے کا آغاز کیا تھا۔ ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۵ء کے آس پاس کالج نے دوبارہ ایک چھاپہ خانہ ''مطبع العلوم'' کے نام سے لگا لیا تھا جس کے ذریعہ ۱۸۴۵ء تک تقریباً ۷۵ کتابیں ترجمہ کروانے کے بعد شائع کی گئی تھیں۔ مسٹر بوٹرو کے بعد مسٹر ایلوئے اسپرنگر (Mr. Alloy Springer) دہلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ انھوں نے ۱۸۴۷ء میں آرکیالوجیکل سوسائٹی قائم کی تھی۔ اس سوسائٹی کو مسٹر تھامس مٹکاف کی سرپرستی حاصل تھی۔

مسٹر تھامس تھیوفیلس مٹکاف (Mr. Thomos Theophilus Metcalf) جو کافی عرصہ سے دہلی میں رہائش پذیر تھے، ۱۸۳۵ء میں ولیم فریزر کے قتل کے بعد مغل

کورٹ میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے بطور متعین کر دیئے گئے تھے۔ وہ ایک با اقتدار شخص تو تھے ہی لیکن اس کے علاوہ دہلی کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں ان کا ایک اہم مقام تھا۔ وہ خاص طور پر فائن آرٹس (جیسے شاعری، موسیقی، رقص، مصوری وغیرہ) اور آرکیالوجی میں مخصوص دلچسپی رکھتے تھے۔ پرانی تاریخی عمارتیں ہمیشہ ان کی دلچسپی کا مرکز بنی رہتی تھیں ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء میں تھامس میٹکاف نے مغل کورٹ کے مشہور آرٹسٹ مظہر علی خاں سے دہلی کی اہم تاریخی عمارتوں کی تصویریں بنوا کر ایک البم بعنوان ''شاہی دہلی کی یادگاریں'' (Reminisceness of Imperial Delhi) ترتیب دیا تھا جو بعد میں ''دہلی البم'' کے نام سے مشہور ہوا تھا۔

مسٹر تھامس مٹکاف نے یہ البم اپنی بیٹی کے لیے تیار کروایا تھا جو انگلستان میں زیر تعلیم تھی اور ہندوستان آنے والی تھی۔ مٹکاف چاہتے تھے کہ ہندوستان آنے سے پہلے ان کی بیٹی یہاں کے ماحول سے مانوس اور متعارف ہوجائے۔ اب یہ البم ''دہلی البم'' کے نام سے برٹش لائبریری میں محفوظ ہے۔ ظاہر ہے سرسید کو مسٹر مٹکاف کے ذریعہ ترتیب دیئے جانے والے البم اور آرکیالوجی خصوصاً پرانی تاریخی عمارتوں میں مسٹر مٹکاف کی والہانہ دلچسپی سے بخوبی واقفیت ہوگی۔ اسی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں ایک طرف سرسید کے انگریز شناساؤں کی خواہشات نے انھیں آثار الصنادید کی تصنیف کی تحریک دی ہوگی، وہیں مسٹر تھامس مٹکاف جیسے اعلیٰ مرتبت اور با حیثیت افسر کی نظروں میں آنے کی خواہش بھی اس تحریک کا ایک ضروری جز رہی ہوگی، جس کا ثبوت اس بات سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ آثار الصنادید میں سرسید نے مندرجہ ذیل الفاظ میں مسٹر تھامس مٹکاف کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

''متعلم الدولۃ امین الملک اختصاص یار فان فرزند ارجمند بجان پیوید سلطان سر طامس تیا فلس مٹکف صاحب ریزیڈنٹ بہادر صاحب کلاں بہادر دارالخلافہ شاہجہاں آباد، دام اقبالہ'' ۱

اسی کے ساتھ مسٹر مٹکاف کی شان میں سرسید کی تصنیف کردہ ایک فارسی مثنوی بھی کتاب میں شامل ہے۔

بہر حال اس کتاب کی تصنیف کے پس پردہ جو بھی عوامل شامل رہے ہوں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ''آثار الصنادید'' ہی وہ کتاب ہے جس نے مغربی دنیا کو سرسید کے نام سے روشناس کروایا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسی کتاب کے ذریعہ سرسید کا خود بھی مغرب سے پہلا بھرپور تعارف ہوا تھا۔ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں سرسید کے اپنے پریس ''مطبع السید انوار'' دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کی پہلے دن سے کافی پذیرائی ہوئی تھی۔ یہ بڑے سائز یعنی ۸×۱۱ انچ کے چھ سو ساٹھ صفحات پر مشتمل تھی۔ دہلی میں موجود انگریز افسران کے حلقہ میں بھی اس کتاب کی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اسپرنگر (Alloys Sprenger) اس وقت دہلی کالج کے پرنسپل تھے محمد نعیم تحریر کرتے ہیں کہ مسٹر اسپرنگر نے دہلی کالج کے جریدے ''قران السیدین'' میں سرسید کی اسی کتاب پر مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا تھا:

> ''یہ کتاب نہایت عمدہ ہے اور ہماری سوسائٹی کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ جو پرانی عمارتوں کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔'' ۲

اس کتاب کا ایک نسخہ دہلی کے انگریز کلکٹر اور مجسٹریٹ مسٹر آرتھر اسٹین روبرٹ (Arther Austine Robert) اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے یہ کتاب رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی نذر کر دی تھی۔ سوسائٹی کے ممبروں نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ سوسائٹی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کے ممبر کرنل سیکسن (Col. Saxon) نے آرتھر اسٹین سے خواہش ظاہر کی

تھی کہ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہونا چاہیے۔ آرتھر اسٹین نے انگلستان سے واپس آنے کے بعد اس کا تذکرہ سرسید سے کیا تھا اور سرسید کی مدد سے خود اس کا ترجمہ کرنے کی ایما ظاہر کی تھی ، بلکہ ترجمہ کرنا شروع بھی کر دیا گیا تھا جو ایک مدت تک جاری رہا تھا۔ لیکن یہ ترجمہ کبھی مکمل نہ ہو سکا تھا بلکہ ترجمہ کرنے کی اس طول طویل کوشش کے دوران ہی آثار الصنادید کا وہ نیا روپ ہمارے سامنے آیا تھا جس کو سرسید نے آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن کے بطور ۱۸۵۴ء میں شائع کیا تھا اور جس کے بارے میں محمد نعیم کا خیال ہے کہ یہ دونوں ایڈیشن ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کو ایک ہی کتاب کے دو مختلف ایڈیشنوں کے بجائے دو مختلف کتابیں تصور کیا جاسکتا ہے۔۳

اور حقیقت بھی یہ ہی ہے کہ دونوں ایڈیشنوں کی درمیانی مدت ،یعنی درمیانی سات آٹھ سالوں میں سرسید کے ذہن پر مغربی علوم اور مغربی فکر کے جس قدر اور جس طور کے اثرات مرتب ہوئے تھے ان کا پرتو آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن میں بہت واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ آثار الصنادید کا ترجمہ کرنے کے عمل کے دوران جس طرح کا تبادلہ خیالات سرسید اور مسٹر اسٹین اور دوسرے متعلقہ لوگوں کے مابین ایک لمبے عرصے تک چلتا رہا تھا اس کے ہی نتیجہ میں سرسید کو مغرب میں تاریخ نویسی کی نوعیت اور تاریخ نویسی میں آرکیالوجی، پولیٹکل اکانمی ،ساجیات وغیرہ جیسے جدید علوم کی اہمیت اور افادیت سے واقفیت ہوئی ہوگی۔ اسی کے ساتھ انگلستان میں موجود انگریزی کتابوں کے قاری کے مزاج، پسند اور ناپسند کے ساتھ ان کی ترجیحات سے بھی وہ روشناس ہوئے ہوں گے۔ غرض آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) اور دوسرے ایڈیشن (۱۸۵۴ء) کے درمیانی سات سالوں میں آثار الصنادید کے توسل ہی سے سرسید کو مغربی علوم اور ان کی افادیت سے ہمکنار ہونے کا موقع ملا تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ یہاں ہی سے سرسید کی مغربی جدید علوم سے رغبت کی ابتدا ہوئی تھی۔ ڈیوڈ لیلیویلڈ آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''آثار الصنادید صحیح معنی میں اردو میں تاریخ نویسی کی پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن واقعتاً یہ تاریخ نویسی سے زیادہ فارسی میں پہلے سے موجود مرقعوں اور تذکروں وغیرہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ کتاب کی عبارت میں جگہ جگہ فارسی اشعار بکثرت موجود ہیں۔ پہلے ایڈیشن کی اردو، فارسی زدہ ہے اور جذباتیت سے معمور ہے۔ جس کا انگریزی میں ترجمہ مشکل سے کیا جاسکتا ہے اور غالباً انگریزی زبان کی کتاب کے قاری کو اس میں کوئی دلچسپی بھی نہ ہوگی۔''۴

(لیلیویلڈ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ برٹش لائبریری میں اسی ایڈیشن کا نستعلیق میں چھپا ایک نسخہ موجود ہے جس میں اشکال میں ہاتھ سے رنگ بھرا گیا ہے)

آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن (جو ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا تھا) کے بارے میں لیلیویلڈ لکھتے ہیں کہ:

''پہلے ایڈیشن میں موجود اشکال میں سے کوئی بھی دوسرے ایڈیشن میں موجود نہیں ہے لیکن اردو، فارسی و عربی کتبات کے چھاپے بکثرت موجود ہیں، اسی کے ساتھ ٹیبل، حوالہ جات اور دوسرے جدید عناصر بھی موجود ہیں۔ شاعری نسبتاً بہت کم ہے اور زبان مرصع و مرجع کے بجائے سادہ ہے (جس طرح کی زبان سید احمد خاں اپنی صحافتی تحریروں میں استعمال کرتے تھے)۔''۵

غرض یہ بات قطعی قرین قیاس ہے کہ آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن ترجمہ کی نیت اور کتاب کے انگریزی داں قاری کی ترجیحات کی مطابقت سے از سر نو مرتب کیا گیا تھا، اس کی وضاحت سرسید نے خود ان الفاظ میں کی تھی:

''۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء کے میں نے ایک کتاب ضلع

دہلی کے مکانات کے حال میں لکھ کر چھاپی تھی۔ اس زمانے میں جناب مسٹر آرتھر اسٹین رابرٹس صاحب بہادر کلکٹر مجسٹریٹ شاہجہاں آباد ولایت انگلستان کو تشریف فرما ہوئے اور اس کتاب کو لے جاکر رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا، ممبران سوسائٹی نے اس کتاب کو نہایت پسند کیا، ان میں سے جناب عالی کرنل سکسن صاحب بہادر (شریک محکمہ عالیہ کورٹ آف ڈائرکٹرز) نے صاحب ممدوح کو فرمایا کہ اگر اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو تو بہت بہتر ہے۔ جب کہ صاحب موصوف ولایت ہو کر پھر دہلی تشریف لائے تو انھوں نے اس خاکسار کی شرکت سے اس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اس وقت یہ بات خیال میں آئی کہ اگر از سر نو یہ کتاب بہت اچھی طرح سے مرتب کی جاوے اور جو خرابیاں پہلی کتاب میں موجود ہیں وہ سب درست کی جاویں تو بہت اچھی بات ہے۔ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آرزو کو پورا کیا اور جس طرح دل چاہتا تھا اس طرح یہ کتاب پوری ہوئی۔'' ۶

گارساں دتاسی نے اس دوسرے ایڈیشن کا ۱۸۶۱ء کے آس پاس فرانسیسی میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ جب یہ ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں پہنچا تو اس کی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری مسٹر رین ہولڈ رائٹ نے اپنے خط مورخہ ۲۰ رجون ۱۸۶۴ء کے ذریعہ سرسید کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا آنریری ممبر مقرر کیے جانے کی خوش خبری سنائی تھی۔

ہم نے آثار الصنادید کا مندرجہ بالا تفصیلی تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ ہمارے خیال سے آثار الصنادید سرسید کی فکر وفہم کے ارتقا میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آثار الصنادید کی اشاعت سے پہلے اور بعد میں بھی تقریباً ۱۸۵۰ء تک سرسید کے مذہبی عقائد اور سماجی فکر وفہم عہد وسطیٰ کی روایتی نہج پر قائم تھے۔ ان کے مذہبی عقائد اور فکر پر شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا اثر نمایاں تھا۔ انھوں نے آثار الصنادید کی اشاعت سے ایک سال پہلے ہی ''تحفہ حسن'' (۱۸۴۶ء) شائع کی تھی۔ شاہ عبدالعزیز (شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے اور جانشین) نے ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے عنوان سے ایک کتاب، شیعہ عقائد کی مخالفت میں، فارسی میں لکھی تھی۔ اسی کتاب کے دسویں اور بارہویں ابواب کا ترجمہ سرسید نے ''تحفہ حسن'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا جب سرسید آثار الصنادید کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اسی کے ساتھ ۱۸۵۰ء میں سرسید نے ایک مختصر رسالہ بعنوان ''راہ سنت در رد بدعت'' کے عنوان سے شائع کیا تھا جو پوری طرح سے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ ۱۸۵۰ء تک سرسید کی سائنسی فکر وفہم میں بھی عہد وسطیٰ کی روایتی نہج سے آگے کوئی پیش رفت نظر نہیں آتی ہے۔ اس زمانے میں ان کی سائنسی استعداد کا اندازہ ان کی تصنیف بعنوان ''قول متین در ابطال حرکت زمین'' سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو ۱۸۵۰ء ہی میں شائع کی گئی تھی اور جس میں زمین کے گرد سورج کے گردش کرنے کی تائید میں مختلف ثبوت اور اسناد پیش کی گئی تھیں۔ غرض ۱۸۵۰ء کے بعد جب کہ ''آثار الصنادید'' کے انگریزی ترجمہ کے سلسلے کی کوششیں شروع کی گئی تھیں، سرسید کے اس عبوری دور کی ابتدا ہوئی تھی جس کے دوران سرسید کا مغربی فکر اور جدید سائنسی علوم سے متعارف ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں آرکیالوجیکل سوسائٹی دہلی نے سرسید کو سوسائٹی کی ممبر شپ آفر کی تھی۔ سرسید کی فکر کا یہ عبوری دور ساتھ آٹھ سالوں کے طویل عرصہ پر محیط رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے تین یونیورسٹیاں (مدراس، بمبئی اور کلکتہ یونیورسٹی) قائم کی گئی تھیں، ڈاک اور خاص طور پر ''تار برقی'' کا انتظام (۱۸۵۴ء میں) باقاعدہ منظم ہو گیا تھا۔ بمبئی اور کلکتہ میں (جدید تعلیم کے واسطہ) میڈیکل کالج قائم ہو چکے تھے۔ ریل کی پٹریاں بچھانے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ (۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے بنارس تک ریل سے آمد و رفت کا سلسلہ

شروع ہوگیا تھا) غرض شمالی ہندوستان میں کلونیل جدیدیت کی ایک نئی فضا تیار ہوگئی تھی۔ سرسید اس نئی فضا کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس میں موجود تازہ ہوا کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابھی یہ خوش گوار تجربہ اپنے ابتدائی مراحل ہی میں تھا کہ برٹش امپیریل ازم کے سیاسی اور معاشی استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی عوام نے ۱۸۵۷ء میں علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے سرسید کی جدیدیت کی فکر وفہم کے ارتقائی عمل میں وہ پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں جن کا عکس ہمیں ان کے طرز عمل کے تضادات کی صورت میں گاہے گاہے نظر آتا رہتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد قدرتی طور پر ان کی فکر میں ''دوام وبقا'' کی فکر نے مرکزیت حاصل کر لی تھی اور وہ مغل ارسٹوکریسی یعنی ''اشرافیہ'' کی ''مدافعتی'' تدبیروں میں مصروف نظر آنے لگے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد سرسید کی ترجیحات میں مغل ارسٹوکریسی یعنی ''اشرافیہ'' اور کمپنی سرکار کے اعلیٰ افسران کے درمیان ایک ایسا مراسلاتی ''پل'' ترتیب دینا اولیت کا حامل تھا جس کے ذریعہ سرکار کو ''اشرافیہ'' کی وفاداری اور وفاشعاری کا مکمل یقین دلایا جاسکے۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے چھ سات سالوں میں یہ کام نہایت تن دہی سے انجام دیا تھا اور اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی تھی۔ سرسید کی اس دور کی تصنیفات مثلاً ''اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۹ء)''، ''لائل محمڈنز آف انڈیا (۱۸۶۰ء)''، ''تبیین الکلام تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام (۱۸۶۲ء)'' ان کے اس وقت کے اسی ترجیحی مقصد کو حاصل کرنے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سرسید کی فکر وفہم کا یہ مدافعتی فکر کا دور ایک عارضی دور تھا اور چھ سات سال کے عرصہ پر ہی محدود رہا تھا جس کے بعد پھر سے سرسید کی عقلیت پسندی اور جدیدیت کے افکار کا ارتقائی عمل دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر واپس آ گیا تھا جس کا اظہار ۱۸۶۴ء میں قائم کی گئی سائنٹیفک سوسائٹی اور اس کے ذریعہ انجام دیے گئے گوناگوں جدید کارناموں سے عیاں ہوتا ہے جن میں کلونیل جدیدیت اور مغربیت کے بجائے عقلیت اور معروضیت کے حامل عوامل کی تشہیر کی کوششیں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

☆

حوالہ جات:

۱- آثار الصنادید (طبع اول ۱۸۴۷ء) عکسی ایڈیشن، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص ۸

۲- سید احمد خاں اور ہیز ٹو بکس کالڈ آثار الصنادید (Syed Ahmad Khan and his two books called Asarus Sanadeed) مصنفہ چودھری محمد نعیم، ماڈرن انڈین اسٹڈیز کیمبرج یونیورسٹی پریس (۲۰۰۰ء)، ص ۱۴

۳- ایضاً، ص ۸

۴- سرسید پبلک اسفیئر، مصنفہ ڈیوڈ لیلیویلڈ، کراکو انڈالوجی اسٹڈیز (۲۰۰۹ء) جلد ۱۱، ص ۲۵۴

۵- ایضاً، ص ۲۵۵

۶- آثار الصنادید (طبع ثانی)، مصنفہ سید احمد خاں، منصف درجہ اول، مطبع سلطانی واقع قلعہ معلی (۱۸۵۴ء) ص ۳

۷- ''شروع کی بات'' آثار الصنادید (طبع اول کا عکسی ایڈیشن) سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۲۰۰۷ء) ص ۲۶۸

مرشدِ اولیں کی یاد میں

عابد رضا بیدار

آیئے عرض گزاریں کہ (صلاح الدین محمود کی زبان مستعار لیتے ہوئے) مرشد کی وفات کو ابھی پانچ اوپر تیس سال گزرے تھے کہ ہم اس عالم رنگ و بو میں وارد ہو گئے۔ ابھی ابوالکلام بھی زندہ تھے، اقبال بھی، حسرت موہانی، اور ذاکر حسین بھی، سیدین بھی: ان سب کی آنکھیں دیکھیں بلکہ اقبال بھی زندہ تھے، (مگر اقبال کی وفات کے وقت میں ابھی شعوری عمر میں داخل نہیں ہوا تھا)، میں نے شعور سنبھالا تو سید سے نہ سہی ان کے دھڑکتے دل، علی گڑھ سے ملاقات ہوئی تو 20 برس کے قریب مزید گزر چکے تھے، وہاں علی گڑھ کے وہ سب مذکورہ نامور فرزند مل گئے، اور ایسے ملے کہ: پھر کہیں کا نہ چھوڑا:

اک دن وہ مل گئے سر رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

پھر یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ہزار میل دور خدا بخش کی چشم نگراں نے blessingsدیں، ان کے ادارے سے تو سر سید کی تفسیر چھپی، اصول تفسیر بھی، اسباب بغاوت ہند بھی؛ بلکہ سید کے 'مخدوم' حالی کی مسدس بھی، مگر سید کے افکار خود سید کے علی گڑھ میں اچھوت ہی سمجھے جاتے رہے۔

سر سید کی ''اسباب بغاوت ہند/ Causes of Indian Revolt'' کئی لحاظ سے ہندستانی دانشوری کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں بھی کہ اس نے 1857ء کے بعد کے کڑے دور میں ہندستانی قوم کو بالعموم اور ہندستانی مسلمانوں کو بالخصوص Rehabilitate کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد بھی سر سید نے جتنے کام کیے، سب کے سب اسی ایک علامتی لفظ Rehabitation کی کوشش کے گرد گھومتے رہے ہیں، بس نام اور موضوع بدلتے رہے۔

1857ء کے بعد سر سید کی بصیرت نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ سات سمندر پار سے آنے والی سفید فارم قوم سے یا تو لڑنا ہوگا یا ساتھ رہنا ہوگا؛ اور دونوں صورتوں میں خود ان کو سمجھنا، اور اپنی قوم کے بارے میں انھیں سمجھانا ضروری بلکہ ناگزیر ہے/ تھا۔

آج، کیا سر سید کی اس بصیرت کی تکرار کی ضرورت نہیں ہے؟ مسئلہ جوں کا توں ہے صرف فریق بدل گئے ہیں۔

تو، جناب، کبھی اس باغی سر سید سے بھی ملیے (مصنف اسبابِ بغاوتِ ہند) جس کی اس کتاب کی اشاعت پر کئی وکٹوریہ پرست انگریزوں نے اسے تاج برطانیہ کا سب سے خطرناک دشمن قرار دیا تھا اور اس پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

چاروں طرف پھیلے انگریزی استبداد کے ظلم وستم اور جابریت کے بیچوں بیچ رہ کر اس کتابچہ نے جرأت مندی اور بے خوفی کا وہ بے مثال مظاہرہ کیا جو ایسے بھیانک وقت میں کسی ہندستانی سے کسی طور بھی ممکن نہ تھا۔ معاصر تحریروں میں شاید کوئی اور مثال ملے بھی نہیں۔ اس کتابچہ میں تاج برطانیہ کا وفادار سر سید نہیں ملتا،

باغی سرسید سے ملاقات ہوتی ہے ہماری! جب ہی تو، حالی کے بقول: ''اس وقت کے فارین سکریٹری (انگلستان کے وزیر خارجہ) نے ان کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے، اور کوئی معقول جواب نہ دے تو سخت سزا دینی چاہیے''۔

تیس چالیس سال بعد، پیچھے مڑ کے دیکھتے ہوئے تھیوڈور ماریسن نے لکھا کہ: ''انگریزوں میں بہت سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ فتح کے بعد دل کھول کر انتقام لیں۔ اور ان کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاص کر بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں، اس وحشیانہ حالت میں جب کہ شدید تر حالات پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی منھ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی......''۔

تاریخ سیاسیاتِ ہند اور تاریخ جدوجہد آزادی کا یہ ایک سنہرا باب صرف سرسید نے لکھا، اور وطن عزیز کے لئے اپنی جان اور عزت کو داؤں پر لگا کر لکھا کہ ''اصل سبب فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں:......شریک نہ ہونا ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل میں! ......باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں''۔

ماریسن نے اسے پڑھنے کے بعد ایک بار پھر لکھا: ''1858ء میں یہ دلیری کے الفاظ تھے! باوجود اس کے......جو لوگ سرسید کے اس برتاؤ پر جو نیشنل کانگریس کے ساتھ کیا، الزام لگاتے ہیں، ان کے لئے اس بات پر غور کرنا مفید ہوگا کہ اس نے اتنی مدت پہلے، جتنی کہ 58ء سے اب تک [1898= سال وفات سید] گزری، گورنمنٹ پر زور ڈالا تھا کہ لیجسلیٹو کونسل میں دیسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے''۔

برمنگھم کے ڈیلی گزٹ کا یہ تبصرہ بھی لائق توجہ ہے کہ ''[سرسید کی بیان کردہ] شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا کہ ہندستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی......اور ہندستانی جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور پریزیڈنسیوں کی لیجسلیٹیو کونسلوں میں شریک کیے گئے''۔ سینٹ جیمس بجٹ نے لکھا کہ ''سید احمد کی وہ خواہش جو ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی، پوری ہوئی، لیکن ابھی اس کی شکایت میں زور ہے''۔ یہ سب نقل کر کے حالی نے کچھ تفصیل بھی دی کہ ''1860ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا، اور 1861ء میں، لیجسلیٹیو ہندستانی......کونسل کی ممبری پر نامزد کئے گئے۔ چنانچہ جنوری 1862ء کے اجلاس کونسل میں ہم پہلی بار مہاراجہ نریندر سنگھ رئیس پٹیالہ، راجہ دیو نرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ ڈنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار کو شریک پاتے ہیں اور اگرچہ اس وقت ہندستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا، مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اس پودے کا، جواب کس قدر بارآور ہونے لگا ہے اور ان کا یہ احسان پورے ملک پر رہے گا......کتاب مذکور (اسباب بغاوت ہند) میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر نہیں مقرر کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی 1862ء میں پہلی بار پنڈت شمبھو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوتے تھے، ملنے لگے''۔

سرسید کی یہ تنہا اتنی بڑی خدمت تھی کہ ہمارے پولیٹیکل سائنٹسٹ اس کتاب کو 19 ویں صدی کے سیاسی افکار اور عملی سیاسیات دونوں کا سنگ میل قرار دیتے! مگر خود ہمارے اپنے کم اندیش دانشور اور ادھ کچرے سیکولر، اپنوں کو متوجہ نہ کر سکے تو

غیروں کو کیا کہیں! بس ایک رٹ ہے جو لگی ہے تو لگے جا رہی ہے کہ سرسید اینٹی کانگریس تھے، اس لیے اینٹی نیشنل ہوئے۔ کم سوادوں کو نہ تو اپنے آپ کو 19 ویں صدی میں پہنچانے کے عمل سے گزارنا آتا ہے، اور نہ اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی کبھی منزل تک پہنچنے کے ایک سے زیادہ راستے بھی ہوا کرتے ہیں؛ اور یہ کہ خاص کر مسلمانوں (باغیوں) پر پڑے اس کڑے وقت میں قوم پرستی کا تنہا نام [انڈین نیشنل کانگریس] ہی تو نہیں تھا۔

سید کے اس زمانہ کے اسٹینڈ (موقف) کی بنیادی اہمیت اور ہمارے لحاظ سے آج کے ہندوستان میں اس کی معنویت کی طرف سینٹ جیمس بجٹ نے جس خوبصورتی سے اشارہ کیا تھا، حالی نے اسے اس طرح اردو میں ڈھالا تھا: ''ابھی سرسید کی اس شکایت میں زور ہے کہ...... دونوں، طرفداری اور غلط فہمی ہونے کے سبب، ہنوز ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور یہ اکثر صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالاتر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق نہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے...... سرسید نے خاص کر ایسے خیالات پر زور دیا تھا کہ جو بات دونوں کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حالات کو بخوبی سمجھیں۔ سرسید نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر واقعات کی بنیاد...... بجائے ناراضی کے غلط فہمی تھی، پس اگر ایک دوسرے کے خیالات سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو ان کے باہمی تعلقات بہت زیادہ مربوط و مستحکم ہو جائیں گے۔ انھیں خیالات سے ہندوستان کے مسائل حل ہوں گے اور انھیں کی دوسری صورت ہے علی گڑھ کالج'' کل بھی اور آج بھی!

اگر اوس وقت کے 'دونوں' میں افہام و تفہیم کی ضرورت تھی (اور اس کے لئے ایک علی گڑھ کالج قائم ہوا) تو کیا 'آج کے دونوں' میں افہام و تفہیم، اوس وقت سے بھی زیادہ ضروری نہیں ہے؟ مت کہیے مجھ سے کہ آج تو ہم آزاد سیکولر جمہوریہ کے برابر کے شہری ہیں، اور قوم کی تقدیر سازی میں برابر کے شریک! یہ سب درست، لیکن جب کوئی decision یا فیصلہ لینے کا لمحہ آتا ہے تو یہ سب کا سب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے!! وجہ وہی ہے جو اوپر کے اقتباسات میں سرسید نے بہ زبانِ دیگر بیان کی ہے: یعنی دونوں نے ایک دوسرے کو قریب سے سمجھا ہی نہیں، اب تک!

سرسید کا ایک مشن تھا: دو قوموں، دو مذہبوں، دو تہذیبوں میں بڑھتے ہوئے فاصلوں کو قربت میں بدل دینا، ان کی دو صد سالہ یاد منانے اور یادگاریں قائم کرنے کے ذیل میں یہ بات بھی طے ہوئی کہ بین المذاہب مفاہمہ کے لئے جا بجا مرکز قائم کیے جائیں: علی گڑھ سے ایک المناکی شروعات ہوئی، پھر یونیورسٹی نے بھی ایک مرکز وظیفہ لب کے طور سے قائم کر دیا۔ مفاہمہ تحریک کی طرف سے زور اس پر رہا کہ:

مذہب تو سب سچے ہیں اور اچھے ہیں، مگر میرا مذہب میرے لئے اور تمہارا مذہب تمہارے لئے! بات آگے بڑھتی ہے کہ میرا مذہب میرے لئے سب سے اچھا اور سب سے سچا، کسی بھی دوسرے کا مذہب اس کے لئے سب سے اچھا سب سے سچا! بات اور آگے بڑھتی ہے کہ ع جہاں باز وسمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے! یعنی میرا مذہب ہی سب سے سچا ہے اور سب سے اچھا ہے! بات پھر اور آگے بڑھتی ہے کہ: تو، دوسرے مذہب والوں کو چاہیے کہ وہ اپنا اپنا مذہب چھوڑ کر میرے مذہب میں جوق در جوق داخل ہوں کیوں کہ وہ سب ٹھہرے جھوٹے مذہب والے، بس میں ہوں سچے مذہب والا!

یہ جو آویزشوں کا سلسلہ چلا، اور آدمی جانور بننے لگا، تو خیال آیا پہل تو ایسے ہی کرنی ہوگی کہ ایک دوسرے کو سمجھا جائے، اور، ہر دوسرے کے مذہب کو عزت دیتے ہوئے سمجھا جائے۔

اس کے لئے علی گڑھ نے ہندو مذہب پر سب سے پہلے ایک بنیادی دستاویز چھاپی بعنوان ''مرکز برائے مفاہمہ بین

المذاہب''۔ پھر اسلام کے تعارف میں ایک کتاب شائع کی: ''اسلام کیا ہے'' (از ابوالفضل م 1947ء)۔ اب سمجھنے سمجھانے کی بات بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی تھی، مسلم یونیورسٹی میں ہندو مخطوطات پر ایک بڑا اہم ذخیرہ ہے، یہ سنسکرت صحائف یا ان کے متعلقات کے قدیم فارسی تراجم ہیں، انھیں انگریزی، ہندی اور اردو میں متعارف کرادیا گیا۔

پھر جم کے کچھ کام ہوا کہ ہندو دھرم اور اسلام پر سیاست کاروں نے جو کالکھ پوت دی ہے، اسے صاف کر کے نکھار کے، اصل ہندوازم، اصل اسلام کو بھی دیکھنے کی فرصت نکالی جائے، کوشش کی جائے کہ انسانیت جو کبھی دین کبھی دھرم کے نام سے زندہ تھی، اسے بھی سانس لینے کی گنجائش نکالی جائے۔ اس ذیل میں سید جشن کے موقع سے جو قیمتی تحریریں شائع ہوئیں ان کا ذکر اپنی جگہ پر آچکا، (پنڈت سندر لال، مولانا مناظر حسن گیلانی، بشمبھر ناتھ پانڈے وغیرہ) کیا ایسے میں جب گھٹا ٹوپ بادلوں نے چاروں اندھیرا چھادیا ہو، کیا لکھنے لکھانے سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ خاص طور سے جب سیاست کار بازی مار گئے ہوں اور دانشور اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک کر بیٹھ گئے ہوں؟ کرنا تو کچھ ہوگا، جتنی جس کی سکت ہو، بس ایسے میں یاد اس عظیم دانشور ہی کی آتی ہے جس نے کہا تھا: اندھیرے جتنے بھی گھنگھور ہو جائیں ایسے میں ایک ننھی سی شمع جلا ڈالو جسے ساری دنیا کے اندھیرے مل کر بجھانے کی طاقت نہیں رکھتے، نہیں بجھا سکتے اس لئے کہ شمع تو روشنی ہی دے گی اندھیروں میں اتنی سکت ہی کہاں کہ ننھی سی شمع کو بھی بجھادیں۔

☆

مختار مسعود کی اہم کتابیں

تحسین سخن شناس:

آواز دوست: لفظ لفظ قابل داد، بعض فقرے لاجواب اور بعض صفحات داد سے بالاتر۔

سفر نصیب: چشم بینا کا سفر جو زاد حیات سمیٹے تلاش حق میں سرگرداں ہے۔ اس میں شامل دو خاکے اردو کے بہترین خاکوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

لوح ایام: موضوع ایران کا انقلاب، مخاطب اہل پاکستان، لکھنے والا انقلاب کا چشم دید گواہ، واقعات حیران کن، بیان مسحور کن، نتیجہ ایک منفرد ادبی شاہکار۔

حرف شوق: آنے والی نسلیں اس تحریر میں دیکھ کر کہہ سکیں گی کہ حال کو ماضی سے مربوط کر کے امروز کے آئینہ میں فردا کی تلاش کیسے کی جاسکتی ہے۔

سرسید کا کردار

الطاف احمد اعظمی

سید احمد خاں نے جس عہد اور ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ ایک مصنوعی ماحول تھا، جسدِ بے روح، پوستِ بے مغز۔ اس ناموافق ماحول میں تعمیر سیرت نہایت مشکل کام تھا۔ خود سرسید کی ابتدائی زندگی اس خراب ماحول کے اثراتِ بد سے محفوظ نہ رہ سکی۔ لیکن عنفوانِ شباب میں بڑے بھائی کے انتقال نے ان کی زندگی کی کایا مکمل طور پر پلٹ دی۔ اس انقلاب کو دستِ قدرت کی کرشمہ سازی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے الم ناک حادثہ کے بعد سرسید نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر نو کے لیے جو تعلیمی اور اصلاحی مشن شروع کیا، بعض وجوہ سے ان کے ایک طبقے کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی اور ان پر کئی طرح کے الزامات لگائے گئے حتیٰ کہ انھیں کرستان اور ملحد وزندیق قرار دیا گیا، لیکن ان کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ان کے کردار پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں کی۔ بعض کم ظرف لوگوں نے ان پر خود غرضی اور حب جاہ کا ضرور الزام لگایا لیکن یہ ان کی کم فہمی اور تمام تر سوئے ظن تھا۔ حالی لکھتے ہیں:

''سب سے زیادہ گراں وزن اور جامع الفاظ جو کسی کی تعریف میں کہے جاسکتے ہیں اس کے سوا خیال میں نہیں آتے کہ فلاں شخص اعلیٰ درجہ کا دل و دماغ رکھتا ہے لیکن اکثر ان الفاظ کا استعمال اپنے محل پر نہیں ہوتا کیونکہ لیاقت جو دماغ سے علاقہ رکھتی ہے اور نیکی جو دل سے علاقہ رکھتی ہے، یہ دونوں اکثر ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ مگر سرسید میں جس طرح بعض دیگر متضاد لیاقتیں جمع تھیں اسی طرح خدا تعالیٰ نے دل و دماغ دونوں اعلیٰ درجہ کے عنایت کیے تھے یہاں تک کہ اس کی نسبت یہ کہنا مشکل تھا کہ اس میں نیکی زیادہ ہے یا عقل، لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی رایوں میں تو شاید خطا کی گنجائش ہو مگر اس کے خلاف رزائل سے بالکل پاک معلوم ہوتے تھے۔ اسی لیے مسٹر بک نے اس کے مرنے کے بعد اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ ''گو اس کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اس کے اخلاق ان سے بڑے تھے۔'' آگے مزید لکھتے ہیں:

''اس (سرسید) نے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کے پبلک لائف میں بسر کیے جن میں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گزرے کہ ایک زمانہ اس کی عیب جوئی کی گھات میں رہا، اور دوست اور دشمن سب کو اس کے ادنیٰ ادنیٰ کام دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا، مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا ہے اور مدرسہ کی اعانت منقطع ہوجائے، باوجود اس کے کسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اس کے کیرکٹر پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اس کے چال چلن میں کوئی فیہ نکالتا سوا اس کے کہ اس کو کافر و ملحد و نیچری و کرستان کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا۔'' (حیات جاوید، ص:۷۱۶-۷۱۷)

حالی نے ''حیات جاوید'' میں سرسید کی سیرت کے تقریباً تمام اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور تفصیل سے ان کے اخلاق و خصائل بیان کیے ہیں۔ میں یہاں ان کے ایک ایسے اخلاقی وصف کا ذکر کروں گا جو ایک اچھے انسان کے اوصافِ حمیدہ میں نمایاں درجہ رکھتا ہے، اور وہ وصف راستبازی ہے۔ یعنی ہر حال میں سچی بات کہنا۔ حالی لکھتے ہیں:

''کسی حکیم کا قول ہے کہ ''اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو وہ ضرور شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی''۔ اس قول کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھ کر ہوتی تھی شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اس نے محض اپنی راست بازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اس کے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا، جس بات پر دل سے یقین کرلیا اسی کے موافق کہا

اور ویسا ہی کیا۔ جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اس کے کہنے اور کرنے میں کسی کی مخالفت کی کچھ پروا نہیں کی۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہاں تک کہ ان کی طبیعت اور جبلت کا اندازہ ہوسکتا تھا، یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنے کانشنس کے خلاف کوئی کام کیا ہو"۔ (حیات جاوید، ص: ۷۱۹)

سرسید کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن سے ان کی طبیعت کا کھرا پن اور سچ بولنے کی عادت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی بات اذیت رساں نہیں تھی کہ کوئی شخص ان پر دروغ گوئی کا الزام لگائے۔ جن دنوں وہ انگلستان میں تھے انھوں نے ہندوستان کے طریقۂ تعلیم کی خرابیوں پر ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا تھا۔ اس پمفلٹ میں ایک دیہی مدرسہ کے متعلق جس کا انھوں نے خود معائنہ کیا تھا، لکھا کہ اس کے اندر گائے بندھی ہوئی تھی اور وہاں کوئی مدرس تھا اور نہ طالب علم۔ یہ پمفلٹ جب ہندوستان پہنچا تو سرولیم میور کی نظر سے بھی گزرا جو ان دنوں شمال مغربی اضلاع کے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ انھوں نے ایک پبلک اسپیچ میں سرسید کے بیان سے اختلاف کیا۔ جب ولیم میور کی یہ تقریر اخبارات میں شائع ہوئی اور اس کی اطلاع سرسید کو ہوئی تو اس خیال سے ان کو بے حد رنج پہنچا کہ ان کے بیان کو دروغ گوئی پر محمول کیا گیا۔

جب وہ ہندوستان واپس آئے تو سرولیم میور سے ملے بغیر بنارس چلے گئے۔ ولیم میور کے پرائیویٹ سکریٹری نے سرسید کو خط لکھا کہ "جناب لیفٹیننٹ گورنر آپ کے بخیر وعافیت ہندوستان پہنچنے سے بہت خوش ہوئے ہیں اور آپ کی خیریت معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں"۔ سرسید نے اس خط کے جواب میں صاف گوئی سے لکھا کہ وہ اب تک کیوں ان سے نہیں ملے اور نہ ہی کوئی خط لکھا۔ اس خط کے جواب میں ولیم میور نے لکھا:

"مائی ڈیر سرسید احمد! آپ کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقع بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال کیا ہوگا"۔ (حیات جاوید، ص: ۷۲۲-۷۲۳)

سچ بات کہنے کی عادت سرسید کی طبیعت میں اس درجہ راسخ تھی کہ خود اپنی ذات کی کم زوریوں کی پردہ پوشی کی بھی کوشش نہیں کی، بسا اوقات کھلے عام ان کو ظاہر کردیتے تھے۔ ان کے ایک نہایت عزیز دوست (مولوی مشتاق حسین) کا انگریز افسر کام کے اوقات میں نماز پڑھنے پر معترض ہوتا تھا۔ تنگ آکر انھوں نے سرسید کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ سرسید نے اس کے جواب میں انھیں لکھا:

"کل سارے دن متردد رہا کیونکہ تمھارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہوسکتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں، اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے، مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا، نہایت لچر پنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے خود اپنی شامتِ اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں، کہنا واہیات تھا، تڑاق سے استعفیٰ دے دینا تھا، صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی، کیا ہوتا، نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مرجاتے نہایت اچھا تھا"۔ (حیات جاوید، ص: ۷۲۰)

سرسید کا یہ مکتوب خود احتسابی، راست گوئی اور دینی حمیت کا ایک حسین مرقع ہے۔ جس میں ان کی شخصیت کے بنیادی خدوخال بالکل نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

☆

سرسید کا احتجاجی کردار

شافع قدوائی

علی گڑھ تحریک کے دوررس اور ہمہ گیر اصلاحی مقاصد اور اس کے وسیع تر فکری، مابعد الطبیعیاتی، علمی، تعلیمی، اخلاقی، ثقافتی اور معاشرتی مضمرات کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کی سربلندی پر مرکوز فکری اور عملی کاوشوں کی بنا پر سرسید کو بجا طور پر مسیحائے قوم کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا کی دردمندی اور اخلاص کے اعتراف کے ساتھ ہی یہ بھی عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ نوآبادیاتی تسلط کو قائم کرنے اور اسے استحکام عطا کرنے میں ان حضرات نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ سرسید کی بیشتر تحریریں مغرب کی فکری فتوحات اور علمی اکتسابات کے سامنے سرتسلیم خم کرنے سے عبارت ہیں۔ تاریخ سرکشی بجنور، اسباب بغاوت ہند، رسالہ خیر خواہان مسلمان ہند، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام اور کانگریس کی مسلسل مخالفت کو اس اجمال کی تفصیل پر گواہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ حیات جاوید کی اشاعت کے بعد تو یہ مفروضہ ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ علی گڑھ تحریک اصلاً مفاہمت سے عبارت تھی اور سرسید کا بنیادی مقصد مغربی نظام اقدار، نظام تعلیم اور رویائے زیست کو برصغیر کے مسلمانوں میں قابل قبول بنا کر برطانوی تسلط (British Hegemony) کو استحکام بخشنا تھا۔

سرسید اور علی گڑھ تحریک سے متعلق ان آراء میں جزوی صداقت ضرور ہے مگر علی گڑھ تحریک کو برطانوی حکومت کی غیر مشروط اور غیر متزلزل حمایت سے تعبیر کرنا حقائق کی رو سے درست نہیں ہے اور اس مقالے میں اس امر کو ہدف بنایا جارہا ہے کہ سرسید نے عام تصور کے برخلاف کن کن مراحل پر برطانوی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ان کے احتجاج کی نوعیت کیا تھی۔ علی گڑھ تحریک کے احتجاجی کردار پر گفتگو بہت کم ہوئی ہے لہٰذا اسے واضح کرنے کے لئے علی گڑھ تحریک کی اشاعت وترویج میں اساسی کردار ادا کرنے والے کثیر لسانی اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے پرانے شماروں سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ۱۸۶۶ سے لے کر ۱۸۹۸ تک کی فائلوں کے مطالعہ سے انکشاف ہوتا ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء نے صرف حکومتِ برطانیہ کی تائید وحمایت کو اپنا مقصود نہیں بنایا تھا بلکہ متعدد مواقع پر حکومت کے فیصلوں کی کھل کر مخالفت بھی کی تھی اور مغربی اقدار، فکری ترجیحات وعلمی مقدمات پر سوالیہ نشان بھی قائم کئے اور متعدد انگریز مصنفین کی علمی بے بضاعتی اور حقائق کو شعوری طور پر مسخ کرنے کی روش کو بھی بے نقاب کیا۔

علی گڑھ تحریک کا مابہ الامتیاز عنصر انگریزوں سے علمی اور فکری مناظرہ کو قائم کرنا ہے جس کا نقطۂ آغاز ولیم میور کی آنحضرت سے متعلق مشہور کتاب کا قرار واقعی استرداد ہے۔ سرسید نے اپنے سفر انگلستان کا خاص محرک ولیم میور کی اشاعت کو ٹھہرایا کہ اس کے ابطال کے لئے ضروری مواد انگلستان کی لائبریریوں میں موجود تھا۔ سرسید کی یہ کتاب خطبات احمدیہ کے نام سے شائع ہوئی۔

سر سید نے اپنے تعلیمی اور اصلاحی مشن سے مسلمانوں کو واقف کرانے کی غرض سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت شروع کی ۔ یہ اخبار ۳۰/ مارچ ۱۸۶۶ء کو شائع ہوا اور یہ پہلا ہندوستانی اخبار تھا جس کا ادارتی مواد (Editorial Content) چار زبانوں یعنی انگریزی، اردو، فارسی اور عربی پر مشتمل ہوتا تھا گو کہ حالی نے لکھا ہے کہ گزٹ صرف اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا تھا اور حالی کا یہ بیان اردو ادب اور صحافت کے محققین اور علی گڑھ تحریک کے مورخوں بشمول امداد صابری، خلیق احمد نظامی، شان محمد، اصغر عباس، افتخار عالم خاں، طاہر مسعود وغیرہ نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ابتدا ہی سے صحافت کے بنیادی اصول یعنی احتجاج پر روبہ عمل رہا اور حکومت برطانیہ کے ان متعدد اہم فیصلوں کی معروضی انداز میں تنقید کی جن کا تعلق مسلمانوں یا اردو زبان سے تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر میکڈانل نے ہندی کو اردو کا مساوی درجہ دیا تھا اور ۱۸۶۸ء میں شمال مغربی صوبہ میں عدالت کی زبان اردو کے بجائے ہندی قرار دینے کی تحریک شروع کی گئی جسے انگریزوں کی در پردہ حمایت حاصل تھی۔ سر سید نے اپنے اخبار کے توسط سے نہ صرف حکومت کے خلاف پر زور صدائے احتجاج بلند کی بلکہ گزٹ میں ہندی اردو تنازعہ سے متعلق ۲ سال تک مستقل مضامین بھی شائع کیے۔ سر سید نے میکڈانل کے فیصلے کو غیر دانشمندانہ قرار دیتے ہوئے لکھا کہ شمال مغربی صوبہ میں اردو کے سوا کوئی اور زبان بولی نہیں جاتی ۔ مزید برآں اردو میں قانونی اصطلاحوں کے متعین تراجم موجود ہیں اور اگر عدالت کی زبان ہندی قرار دی گئی تو پھر قانونی اصطلاحوں کے ترجمہ کا مسئلہ پیدا ہوگا ۔ اصطلاح کو بہر صورت متعین ہونا چاہیے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع اپنے مضمون 1 میں سر سید نے لکھا کہ عدالتی زبان بالکل Exact ہونا چاہیے اور ہندی اس خوبی سے متصف نہیں لہذا عدالت کی زبان بدلنے کا حکومت کا منصوبہ ناقابل عمل ہے۔ گزٹ نے اردو اور ہندی سے متعلق ۳۵ مضامین بھی شائع کیے اور حکومت کے جانبدارانہ رویہ کے خلاف اپنا پر زور احتجاج درج کرایا۔

سر سید اپنی فکری، علمی، ادبی اور تہذیبی اقدار اور ورثہ سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ وہ ان کے تحفظ کے سلسلہ میں ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ سر سید شاہ ولی اللہ کے افکار و نظریات سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور مذہبی امور میں ان کی اصلاحی تحریک کے زبردست حامی بھی تھے۔ شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد (۱۷۶۲) عبدالعزیز نے اس تحریک کی سربراہی کی ذمہ داری سنبھالی۔ شاہ عبدالعزیز نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا اور پھر شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کی سربراہی میں تحریک جہاد شروع ہوئی۔ بالاکوٹ میں سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد اس تحریک کا زور بہت کم ہوگیا۔ یہ تحریک جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اصلاً غیر ملکی تسلط کے خلاف اور مسلمانوں کے عقائد کی درستگی سے عبارت تھی۔ وہابیوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دہلی میں انگریزوں کے برسر اقتدار آ جانے کے بعد وہابیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی شروع کی گئی۔ ۱۸۶۴ سے ۱۸۷۱ کے درمیان وہابی قائدین کے خلاف پانچ بڑے سرکاری مقدمے چلائے گئے اور پٹنہ میں جب ان کے خلاف مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی اور ملک کے طول و عرض میں وہابیوں کے خلاف حکومت تادیبی کارروائی کر رہی تھی تو سر سید وہابیوں کے دفاع میں سامنے آئے اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے حکومت کے فیصلے کے خلاف باقاعدہ ادارتی مہم کا آغاز کیا۔ سر سید شاہ غلام علی سے بیعت تھے مگر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے افکار و نظریات اور ان کی مذہبی تاویلات کو درست سمجھتے تھے۔ حیات جاوید میں حالی نے سر سید کے مذہبی

عقائد پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے اور انہیں شاہ ولی اللہ کے مسلک کا پیرو کار ٹھہرایا ہے۔ سر سید نے سیرت فریدیہ میں خود کو وہابی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ 2:

''اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر قائم ہیں اس وقت بھی اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے، نہیں پاتا بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن شریف پڑھ کر بخشنے یا فاتحہ دے کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہونچتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو نیابت کا قائل نہیں ہوں اور عبادت مالی میں بھی بجز اس صورت کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لئے کسی کے سپرد کر جاوے، نیابت کا قائل نہیں ہوں۔ تعجب ہے کہ میرا عقیدہ اس زمانہ کے وہابیوں یا اہل حدیث سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ عبادت بدنی کے ثواب پہونچنے میں مختلف ہیں مگر ہر حالت میں عبادت مالی کے ثواب پہونچنے میں سب کو اتفاق ہے''۔

سر سید اپنے عقائد کا برملا اظہار کرتے تھے اور اپنی فکری و نظری ترجیحات کو عیاں کرنے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ سر سید سرکاری ملازم ہونے کے باوجود حکومت کے فیصلوں اور اقدامات کا معروضی طور پر آزادانہ تجزیہ کرتے تھے اور اگر انہیں حکومت کے ناروا سلوک یا زیادتی کا احساس ہوتا تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے صفحات پر اس کا کھل کر اظہار کرتے تھے۔ وہابیوں کی گرفتاری اور ان کے خلاف تعزیری کارروائی کی مزاحمت کا اولین سراغ گزٹ میں ملتا ہے۔ گزٹ نے وہابیوں کے خلاف حکومت کی کارروائی کو بعض مفسد ہندوستانیوں کی سازش قرار دیا اور مخبروں پر انحصار کرنے کے لئے حکومت کو ہدف ملامت بناتے ہوئے ایک اداریہ شائع کیا 3:

''گورنمنٹ سے اس بات کی درخواست ہے کہ جو کچھ بھی اس معاملہ میں کرے حتی الامکان تامل اور حلم کے ساتھ کرے تاکہ اس کی تدبیر مملکت میں امر خلل انداز نہ ہو اور ایسے نازک معاملہ میں حد سے زیادہ تعجیل نہ فرمائے جس کے سبب سے خفیف خفیف باتوں پر لوگوں کو گرفتار کرتی ہے، کیا وہ اپنی پائیدار اور مستحکم حکومت میں ایسی خائف ہے کہ ذرا سا دھوکہ سے اپنے معاندین کا خوف کرنے لگتی ہے، پس اس لحاظ سے ہماری رائے یہی تھی اور اب بھی ہے کہ اگر سرکار کو کسی قسم کا اندیشہ مفسدوں کی طرف سے ہو تو اس اندیشے کو آدابِ سلطنت کے موافق اس خوبصورتی سے رفع فرمائے کہ مفسدوں کو اس سے خوف ہو نہ کہ سرکار کے خائف ہونے کا توہم ہو اور اس کی صورت یہی ہے کہ جو لوگ دراصل مفسد ہیں ان کے حالات پر نہایت تحقیق و تامل کی نظر کر کے ان کی بیخ کنی کرے اور اس امر کو ہرگز قرین صواب نہ خیال فرمائے کہ جس شریف و ذی عزت کی نسبت کسی مفسد یا بدمعاش کے کہنے سے شبہ ہو جائے تو فوراً اس کو اول گرفتار کیا جائے اور جب بخوبی اس کی آبروریزی ہو جائے اور اس عرصہ میں اس کا بے قصور ہونا ثابت ہو جائے تو اس کو رہا کر دیا جائے۔ اس تدبیر سے بجز بات کے کہ رعایا بددل ہو اور کوئی فائدہ متصور نہیں ہے اور جب سرکار جو عمل در کار ایسا ہو جایا کرتا ہے تو بعض مفسد اپنا شعار یہی قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنی قدیمی عداوتوں کو ایسے وقت پر نکالیں اور مخبری سے اپنا روسیاہ کرلیں اور اس سے ان کو کچھ بحث نہیں ہوتی کہ انجام کار ہمارے لئے یا سرکار کے انتظام میں اس سے کیا خلل ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ اضلاع پنجاب میں مخبری کا بازار نہایت گرم ہے اور مفسدوں اور بد معاشوں کے ہاتھ سے شرفا کی جان عذاب ہے''۔

اس اداریہ کے ساتھ ہی گزٹ کے مذکورہ شمارہ میں ایک کارسپانڈنٹ کا طویل مراسلہ شائع کیا گیا ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہابیوں کی سرگرم شمولیت کی مدلل تردید کی گئی تھی۔ گزٹ نے اردو اخباروں کے مدیروں سے توقع کی تھی کہ یہ

مراسلہ وہ اپنے اپنے پرچوں میں نقل کریں گے۔

گزٹ 4 میں ایک اور کارسپانڈنٹ کا ایک مراسلہ شائع کیا گیا جس میں حکومت سے وہابیوں کی تلاش اور تحقیقات کے بجائے مسلمانوں کی تعلیم میں زیادہ کوشش کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی اصلاح صرف تعلیم سے ہوسکتی ہے اور حکومت کے تئیں غلط فہمی تعلیم کے اثر سے ضائع ہوگی۔ مراسلہ نگار نے ٹائمز کی اس رائے سے مکمل اتفاق کیا کہ تشدد وہابیوں کے خلاف نہ ہو اور مسلمانوں کی تعلیم وتربیت پر زور دیا جائے۔ مراسلہ میں یہ بھی کہا گیا کہ وہابی اپنے مذہب کے سچے پیروکار ہوتے ہیں اور مذہب میں سچا ہونا بالکل معیوب نہیں ہے۔ صوبہ بہار کے سکریٹری نے وہابیوں کی تاریخ لکھی تھی جو مراسلہ نگار کے نزدیک بالکل درست نہیں ہے۔

وہابیوں کے خلاف پٹنہ میں زیر سماعت مقدمہ سے متعلق متعدد رپورٹیں گزٹ میں شائع ہوئیں جن میں یہ اطلاع دی گئی کہ امیر خاں وغیرہ سے متعلق مقدمات کی تحقیقات کے لئے ایک خاص کمیشن مقرر کیا گیا ہے جس کے ارکان جسٹس فیر صاحب اور ضلع جج ہوں گے۔

سرسید نے وہابیوں کے دفاع میں نہ صرف گزٹ میں اداریے اور مضامین لکھے بلکہ انگریزی اخبار پاینیر میں مراسلے بھی لکھے جو گزٹ میں بھی شائع کئے گئے۔ اس زمانہ کے انگریزی اخبار مثلاً انگلش مین اور پاینیر وغیرہ وہابیوں کے تئیں حکوت کے مخاصمانہ اور جانبدارانہ رویے کے مکمل حامی تھے اور اس تحریک کے خلاف مسلسل مہم چھیڑے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے دارالحرب ہونے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے کو انگریزی اخبار بڑے نمایاں طور پر شائع کرتے تھے۔ انگلش مین نے مولوی امیر حسن کے فتوی کے خلاف ایک انتہائی تند اداریہ لکھا جس کا جواب سرسید نے پاینیر میں دیا اور یہ مراسلہ گزٹ میں بھی شائع ہوا6:

''صاحب من! مجھ کو اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ بعض انگریزی اخبار نویس نے اس فتوی کے معنی غلط تعبیر کیے ہیں جیسا کہ آپ کے آج کے اخبار میں ہے......... میں پکا وہابی اور وہابیت کا حامی ہوں۔ مجھ کو وہابی بمعنی مفسد کے نہ خیال فرمائیں گے۔ بعض غلط فہم شخصوں نے وہابیت کے معنی بیان کئے ہیں وہ وہابیت کے اصلاً معنی نہیں ہیں۔ جو لوگ فساد بپا کرتے ہیں وہ مذہب کے اصول سے واقف نہیں ہیں جن لوگوں پر الزام لگایا جا رہا ہے اس کی بنا عداوت ہے''۔

سرسید نے اپنے اس مراسلہ میں وہابیوں کی ۱۸۵۷ء میں شرکت کی تردید کی اور قرآن، حدیث اور بعض مشہور عالموں کے حوالوں سے لکھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد شریعت محمدیہ کی رو سے ہرگز جائز نہیں ہے۔ سرسید نے جہاد کے لازمی شرائط کو خاطر نشان کرتے ہوئے لکھا7:

''(۱) جو مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے امن اور حمایت میں رہتے ہوں جس کا مذہب ان کے خلاف ہو تو اس پر جہاد کرنا حرام ہے (۲) جب کسی گورنمنٹ یا قوم کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ ہو تو جہاد حرام ہے اگرچہ وہ مخالف مذہب ہو''۔

سرسید نے اس امر کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران دہلی کے دو وہابیوں نے نہایت جرأت مندی کے ساتھ کہا تھا کہ گورنمنٹ پر جہاد جائز نہیں ہے۔ سرسید کے مطابق وہابی ہونا کسی طرح گورنمنٹ کا مخالف ہونا نہیں ہے''۔ پٹنہ کے مقدمہ کے ضمن میں سرسید نے لکھا کہ سرکار اور عوام الناس دونوں پٹنہ کے مقدمہ میں بڑی احتیاط کی نظر کریں۔

اسی زمانہ میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' شائع ہوئی اور وہابی تحریک اس کا اصل نشانہ تھی۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کی اشاعت نے وہابیوں پر عرصۂ حیات اور تنگ کر دیا۔ لہٰذا سرسید نے مفاہمت کی پالیسی کو خیرباد کہہ کر کھل کر ہنٹر کے الزامات کی تردید کی اور مسلمانوں کے عقائد علی الخصوص وہابیوں

کے افکار ونظریات سے ہنٹر کی عدم واقفیت اوران کی غلط تعبیروں پر سخت گرفت کی ۔ سرسید نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ایک انتہائی مفصل اور مدلل تبصرہ لکھا جو پاینیر میں قسط وار شائع ہوااور یہ تبصرہ گزٹ میں ۱۴ قسطوں میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔اس تبصرہ کی پہلی قسط گزٹ کے ۲۳/نومبر ۱۸۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔سرسید نے ڈاکٹر ہنٹر کے تسامحات،عدم واقفیت اور معروضیت کے لبادے میں ملفوف جانبدارانہ نقطہ نظر پر بڑی دلجمعی سے گفتگو کی اور اسلامی عقائد اور تاریخ سے اپنی گہری واقفیت اور علمی بصیرت کے لازوال نقوش مرتسم کیے۔ مقدمات کی تدوین اور نتائج کے استخراج میں سرسید نے انتہائی دقت نظر اور معروضیت کا ثبوت دیا۔ڈاکٹر ہنٹر کے نقطۂ نظر کو استدلال کے ساتھ رد کیا۔سرسید نے اپنے طویل تبصرہ کی تمہید میں لکھا8:

’’آج کل علی العموم سب لوگوں کی توجہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دلی خیالات کی جانب مائل ہو رہی ہے اور اس کی توجہ کی تین باتیں زیادہ باعث ہیں۔ایک تو وہابیوں کے مقدمات اور دوسرے ڈاکٹر ہنٹر کی وہ کتا جو انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی بابت لکھی ہے اور تیسرے مسٹر نارمن صاحب چیف جسٹس کا قتل۔ہنٹر صاحب کی کتاب کا ہندوستان کے لوگوں میں بہت چرچا ہے اور تمام فرقوں کے لوگوں نے اس کو نہایت شوق اور توجہ سے دیکھا ہے چنانچہ میں نے بھی اس امید سے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا کہ شاید اس کتاب کے سبب سے اس پیچیدہ معاملہ میں جو عوام کے نزدیک ایک دقیق بات ہے مجھ کو کچھ روشنی حاصل ہو .... اہل تصنیف پر یہ بات واجب ہے کہ جب وہ کسی بڑے معاملہ کو بیان کرے اور بعد دریافت کے بھی وہ ایسے معاملات میں اہل تصنیف کے لئے مبالغہ اور قسم کی غلط بیانی کو نہ فرمائے۔ بھلا جب ہم یہ بات اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ایک ایسے افسر نے جو نہایت عالی رتبہ پر ممتاز ہے اور جس پر سرکار کی بھی نظر مہربانی ہے ایسی باتیں اور غلط خیال مسلمانوں کی نسبت بیان کئے ہیں ہرتو ہر مسلمان خواہ مخواہ یہی سمجھے گا کہ شاید تمام انگریز ڈاکٹر صاحب کی رائے سے متفق ہوں گے۔ مجھ کو ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے بہت بڑی بڑی باتوں کی توقع تھی لیکن بڑا افسوس ہے کہ میری توقع بہت سے اور آدمیوں کی طرح مایوسی سے بدل گئی......جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تو برملا میں نے یہی کہا کہ خدا مجھ کو میرے دوستوں سے بچائے‘‘۔

سرسید نے اولاً اس امر پر گرفت کی کہ ایک طرف تو ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے کہ یہ کتاب صرف بنگال کے مسلمانوں سے متعلق ہے کہ وہ ان کے حالات سے بخوبی واقف ہیں مگر انہوں نے اپنے عنوان ’’ہمارے ہندوستان کے مسلمان‘‘ سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان کے معروضات کا اطلاق ملک بھر کے مسلمانوں پر ہوتا ہے۔سرسید نے وہابیوں سے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کی معلومات کو ناقص قرار دیتے ہوئے جہاد کے اسلامی تناظر کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔ سرسید کے مطابق جو نسبت مذہب پروٹسٹنٹ کو رومن کیتھولک کے ساتھ ہے وہی نسبت ایک وہابی کو اسلام کے اور فرقوں کے ساتھ ہے۔ مصنف نے ڈاکٹر ہنٹر کی توجہ وہابیوں سے متعلق انگریزی میں شائع ایک کتاب کی طرف بھی مبذول کرائی جو ۱۸۵۲ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کی تھی۔ ڈاکٹر ہنٹر نے عقائد وہابیت کے ضمن میں سات نکات بیان کئے تھے جو سرسید کے نزدیک حقیقت سے بغایت درجہ دور ہیں اور خلط مبحث کی عبرتناک مثال ہیں۔سرسید نے اس کے بعد جہاد کے اسلامی تناظر کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ اگر حکومت مسلمانوں کی جان و مال کی محافظ ہے اور مذہبی امور میں ان کو آزادی حاصل ہے تو پھر اس کے خلاف جہاد از روئے اسلام جائز نہیں ہے۔

سرسید نے اپنے تبصرے کی دوسری قسط میں ڈاکٹر ہنٹر کے اس بیان کی بھی تردید کی کہ وہابیوں کو شمال مغرب میں قبائلیوں کی

زبردست حمایت حاصل ہوئی تھی اور انہوں نے وہابیوں کی ایما پر انگریزوں کے خلاف تشدد آمیز مہم جاری رکھی۔ سرسید نے لکھا کہ شمال مغرب علاقہ میں قبائلیوں کی اکثریت حنفی المذہب ہے اور وہ وہابیوں کو گمراہ سمجھتی ہے۔ لہٰذا قبائلیوں کے ساتھ وہابیوں کی سازش کا تصور ہی بے معنی ہے۔ وہابیوں نے سکھوں کے ظلم وجبر کے خلاف جہاد شروع کیا اور اس کا تعلق انگریزوں کی مخالفت سے نہیں تھا۔

سرسید نے وہابیوں کے عقائد اور ان کی تاریخ کا بھی بالتفصیل ذکر کیا اور لکھا کہ اہل حدیث ہی اصلاً وہابی ہیں۔ سرسید نے ہندوستان میں وہابیوں کی تاریخ کو پانچ ادوار میں منقسم کیا اور ۱۸۳۰ء میں کلکتہ میں شاہ اسماعیل کے ایک وعظ کا ذکر کیا۔ شاہ اسماعیل سے کسی نے انگریزوں کے خلاف جہاد سے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا، ''انگریزوں نے مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں پہونچائی، انگریزوں کی رعایا از روئے مذہب جہاد میں بھی شریک نہ ہو، سکھوں کے خلاف جہاد میں حکومت نے مدد کی تھی''9۔

سرسید نے یہ بھی لکھا کہ ۱۸۵۱ء میں مولوی عنایت علی اور مولوی عنایت علی ساکن پٹنہ کی قیادت میں لشکر سرحد پر جمع ہوا تھا وہ انگریزوں کے خلاف صف آرائی کی صورت نہیں تھی کہ اس کا مقصد جموں میں رہنے والے سکھوں پر حملہ کرنا تھا''10۔

سرسید نے اپنے تفصیلی تبصرے میں جو بعد میں اردو اور انگریزی میں کتابی صورت میں شائع ہوا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے حوالے سے وہابیوں کے تیئں برطانوی حکومت کے استبدادی رویے کی کھل کر مخالفت کی اور اس ضمن میں کسی قسم کی مصلحت کا لحاظ نہیں رکھا۔ وہابیوں کے خلاف کارروائی کی کھل کر مخالفت علی گڑھ تحریک کے احتجاجی کردار کو بطریق احسن خاطر نشان کرتی ہے۔

علی گڑھ تحریک کے ترجمان علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے حکومت برطانیہ کے مغرور اہلکاروں کی ہندوستانی ملازموں پر سختی کے واقعات پر متعدد بار پرزور احتجاج درج کرایا۔ ۱۸۷۵ء میں پشاور میں ایک انگریز افسر لیفٹیننٹ گریسن نے ایک ہندوستانی اہلکار کو اس قدر مارا کہ وہ مرگیا۔ گزٹ نے اس واقعہ کے خلاف ایک انتہائی تند اور تیز مضمون شائع کیا جس میں اسے ہندوستانیوں کی عزت نفس پر حملہ سے تعبیر کیا گیا11۔ مضمون میں کہا گیا کہ یہ پہلا واقعہ نہیں کہ کسی انگریز نے کسی ہندوستانی کو قتل کیا ہو، اکثر سلام نہ کرنے پر برطانوی افسران چراغ پا ہو جاتے ہیں اور ہندوستانیوں کے لباس پر مشتعل ہو جاتے ہیں اور ہندوستانیوں کو زدوکوب کرتے ہیں، اس سے ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانیوں کا خون اس پانی سے بھی ارزاں ہے جس سے انگریز افسروں کی بندوقیں دھوئی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے انگریزی اخبار انگلش مین، پاینیر، فرینڈس آف انڈیا، نیٹیو اوپینین وغیرہ ہمیشہ انگریز افسران کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور ہندوستانیوں کی بدتمیزی اور بدسلیقگی کو مورد الزام ٹھہراتے۔ گزٹ نے انگریزی اخباروں خصوصاً انگلش مین کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے لکھا کہ جب بھی کوئی ہندوستانی کسی انگریز افسر کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو اخبارات انگریزوں کی سخاوت، فیاضی اور دردمندی کی حکایتیں شائع کرنے لگتے ہیں۔ مضمون میں اس اہم نکتے کو بھی موضوع بحث بنایا گیا کہ ہندوستانی اور انگریز دونوں ملکہ کی رعایا ہیں اور از روئے قانون کسی کو کسی پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔''

شمال مغربی صوبہ کی حکومت گزٹ کی کئی سو کاپیاں خریدتی تھی اور انہیں مختلف اسکولوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اس مضمون کا تیز لہجہ حکومت برداشت نہیں کرسکی اور پہلی بار شمال مغربی صوبہ کے کسی اخبار کو سرکاری وارننگ جاری کی گئی۔ اس وارننگ سے گزٹ کے احتجاجی کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ وارننگ ۲۰/اپریل ۱۸۷۵ء کو جاری کی گئی اور اس کا آفیشیل میمو نمبر 69999 تھا۔

اس وارننگ کی اصل عبارت ملاحظہ کریں:

"Undersigned is directed to invite the

attention of the editor of the Aligarh Institute Gazette to the improper and injustice of the criticizm hazard at page no 181 and 182 of the issue of the 19th March 1875 and to remind him that the paper is taken by the government cannot be expected to subscribe to any paper which expresses opinion on those in the article in question". 12

مہاراجہ میسور، الور اور دیگر ریاستوں کے حکمرانوں اور برطانوی حکومت میں جب بھی کوئی تنازعہ پیدا ہوا تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ہمیشہ دیسی ریاستوں کی ہمنوائی کی اور ان کی تائید میں اداریے شائع کیے۔

ان معروضات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علی گڑھ تحریک محض مصلحت کوشی اور انگریزی حکومت کی ہمنوائی سے عبارت نہیں تھی بلکہ اس نے ایک موثر احتجاجی کردار بھی ادا کیا اور ہندوستانیوں کی عزت نفس اور وقار کو سر بلند رکھنے کی قابل قدر سعی بھی کی۔

حواشی:

1- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۷ رمئی ۱۸۷۱ء
2- سیرت فریدیہ، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۶ء صفحہ ۵۲
3- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، یکم مارچ ۱۸۷۱ء
4- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۴ راپریل ۱۸۷۱ء
5- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۱ راپریل ۱۸۷۱ء
6- ایضاً، ۲۳ رجون ۱۸۷۱ء
7- ایضاً، ۲۳ رجون ۱۸۷۱ء
8- ایضاً، ۸ ردسمبر ۱۸۷۱ء
9- ایضاً
10- ایضاً، ۲۲ ردسمبر ۱۸۷۱ء
11- ایضاً، ۱۹ رمارچ ۱۸۷۵ء
12- ایضاً، ۳۱ راپریل ۱۸۷۵ء

سرسید احمد خاں اور معاصر دینی مدارس سے ربط وتعاون

ظفرالاسلام اصلاحی

سرسید علیہ الرحمہ (۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء - ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) محض میدانِ تعلیم کے مردِ میداں نہیں تھے، بلکہ وہ ایک عظیم مصلح تھے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں سدھار لانے کی کوشش کی۔ وہ بڑے اعلیٰ ظرف اور وسیع النظر تھے۔ معاشرہ کے مختلف طبقے کے لوگوں سے ان کے روابط تھے اور روز مرّہ زندگی میں گوناگوں مصروفیات رکھنے والوں سے ان کے تعلقات استوار تھے۔ موافق ومخالف سب سے مکالمت ومفاہمت کا دروازہ انہوں نے ہمیشہ کھلا رکھا۔ اسی طرح ملک وملت کی فلاح وبہبود کے لئے تگ ودو کرنے والی انجمنوں وتنظیموں سے ربط وتعاون ان کا شیوہ تھا۔ بلا شبہ وہ جدید تعلیم کے علم بردار تھے اور اس راہ میں وہ تا حیات سرگرداں رہے، لیکن ملّی فلاح وبہبود کے کاموں میں ان کی گہری دلچسپی اور وسیع النظری کہ دینی داروں اور مدارس سے بھی روابط قائم رکھے اور ان کی اصلاح وترقی کے لئے فراخ دلانہ تعاون دیتے رہے۔ حقیقت یہ کہ ان کا تصورِ تعلیم بہت سے وسیع و بلند تھا۔ جدید تعلیم کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی وسرگرمی کے ساتھ وہ قدیم تعلیم کی قدر وقیمت کا اعتراف کرتے تھے اور دینی مدارس کی اہمیت وافادیت بھی تسلیم کرتے تھے، یہ اور بات ہے کہ وقت کے تقاضوں کے تحت ان اداروں کے نظام ونصاب میں بھی اصلاح وتبدیلی پر زور دیتے تھے، جیسا کہ ان کی نگارشات سے اس کے وافر ثبوت ملتے ہیں۔ دوسرے یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ سرسید جس وسیع پیمانے پر مختلف ذرائع سے تعلیم کی اشاعت چاہتے تھے، اس کا تقاضا تھا کہ اس سلسلہ میں مختلف حلقوں یا اداروں سے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان سب میں آپس میں تال میل پیدا ہو اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی فضا پروان چڑھے۔ سرسید نے اس ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا، بلکہ اس سمت میں قدم بھی اٹھائے۔ معاصر علماء سے روابط اور اہلِ مدارس سے ربط وتعاون اسی کا ایک حصہ تھا۔ اس راہ میں انہوں نے جس اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا وہ ذیل کی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

سرسید کے معاصر مدارس میں سب سے قدیم ومشہور دارالعلوم دیوبند تھا جو ۱۸۶۶ء میں وجود میں آیا۔ اس مدرسہ اور ادارۂ سرسید (مدرسۃ العلوم/ ایم۔اے۔او کالج، علی گڑھ) دونوں کے منتظمین واساتذہ کے مابین روابط کے بہت سے شواہد مآخذ میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جو حقائق سامنے آتے ہیں، ان کا اجمالی جائزہ اس مضمون میں مقصود ہے۔ ۲۴/مئی ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کے قیام کے بعد جب مختلف مضامین کی تدریس کے لئے اساتذہ کی تقرری عمل میں آئی تو اولین عربی استاد اور منیجر بورڈنگ ہاؤس کی حیثیت سے ساکنِ کاندھلہ مولوی محمد اکبر (م ۸/جولائی ۱۸۸۶ء) کی تقرری ہوئی جو دیوبند کے حلقہ سے تعلق رکھتے تھے[2]۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ ایم۔اے۔او کالج میں دینیات کی تعلیم شروع ہی سے داخلِ نصاب رہی ہے۔ اس کی درسیات کی تعیین اور تدریس کے نظم کے لئے سرسید نے خاص طور سے علماءِ دیوبند سے رابطہ قائم کیا۔ اسی

طرح شعبۂ دینیات کی سربراہی اور کالج کے طلبہ کی مذہبی واخلاقی زندگی کی نگرانی کے لئے ناظمِ دینیات کی تقرری کا مسئلہ درپیش ہوا تو اس سلسلہ میں سرسید نے سب سے پہلے بانی مدرسہ دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے قریبی رفقاء مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور اور مولانا عبد الرشید گنگوہی سے مراسلت کی اور آخر میں ۱۸۹۳ء میں اولین ناظمِ دینیات کی حیثیت سے دیوبندی حلقہ کے مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی کی تقرری عمل میں آئی جو مولانا مملوک علی کے نواسے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے۳۔ حقیقت یہ کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید میں فکری اختلافات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے تئیں ادب و احترام اور قدردانی کے جذبات سے معمور تھے، جیسا کہ ان دونوں کے مابین مراسلات کے مجموعہ ''تصفیۃ العقاید'' (شائع شدہ از مطبع منشی محمد حیات، میرٹھ، ۱۲۹۸ھ) کے مشتملات شاہد ہیں۔ کتاب کی ابتداء میں منقول مولانا محمد نانوتوی کے نام سرسید کے مکتوب کی عبارت ملاحظہ ہو:

''بعد سلام مسنون کے عرض ہے کہ بزرگانِ سہارنپور نے جو نوازش و دلسوزی میرے حال زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا میں دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں میری سعادت ہے، میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھتا ہوں''۴۔

مزید براں بانیِ مدرسہ دیوبند کی وفات پر سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان پر جو تعزیتی تحریر شائع کی تھی وہ بھی ان کے تئیں عقیدت و احترام کے جذبات سے معمور ہے۔ اس تحریر کے آخر میں مولانا مرحوم کے بارے میں سرسید نے یہ تاثر ظاہر کیا: ''خود بھی پابندِ شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابندِ سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا۔ انہی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی''۔ مزید اہم بات یہ کہ اس تحریر کے خاتمہ پر سرسید نے لوگوں سے یہ اپیل کہ وہ اس کی بقا و تحفظ کے لئے کوشش کرتے رہیں، اس سے لوگوں کے دلوں پر ان کی اس عظیم یادگار کا نقش بھی ثبت رہے گا۵۔

اسی ضمن میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان حالات میں جب کہ سرسید کے بعض مذہبی افکار علماء کے حلقہ میں بحث ونقد کا موضوع بنے ہوئے تھے، مدرسہ دیوبند کی سالانہ رپورٹ (بابت سال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) انہیں تبصرہ کے لئے بھیجی گئی۔ تہذیب الاخلاق کے یکم جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کے شمارہ میں اس روداد پر مفصل تبصرہ شائع کیا جو دس صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ تبصرہ تنقیدی تھا، لیکن اصلاح کے جذبہ سے لکھا گیا تھا۔ اس تبصرہ میں مدرسہ کی مالی حالت کی خرابی، نصابِ تعلیم کے نقائص، اس میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت، اس کی مالی امداد کی جانب سے مسلمانوں کی بےتوجہی اور معاش کے نقطۂ نظر سے فارغینِ مدرسہ کی بدحالی پر اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے ساتھ سرسید نے مدرسہ سے دلی ہمدردی اور اس کی اصلاح و ترقی کی خواہش کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس تبصرہ میں مدرسہ کے نصابِ تعلیم پر انہوں نے جو تاثرات ظاہر کئے ہیں، ان کا ماحصل یہ ہے: مدرسہ میں عصری علوم وجدید زبانوں کے پڑھانے کا اہتمام نہیں ہے۔ اس کمی کی وجہ سے طلبہ میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہو پاتی کہ وہ موجودہ دور میں موثر انداز میں اسلام کی ترجمانی کرسکیں، یا مذہب کے بارے میں جدید ذہن کے شکوک وشبہات کو دور کرکے دین کا دفاع کرسکیں۔ دوسرے یہ کہ مدرسہ کے طلبہ کو کوئی ایسا ہنر یا فن نہیں سکھایا جاتا جو وہاں سے فراغت کے بعد ان کے لئے معاش کے مسئلہ کو بہتر طور پر حل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوسکے۶۔ اسی طرح یہ بخوبی معروف ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا

نصابِ تعلیم کافی حد تک درسیات کے مشہور سلسلہ درسِ نظامی پر مبنی ہے اور علماءِ دیوبند کے زیر اثر یہی نصاب ہندوستان کے مدارس و انفرادی تدریسی مراکز میں زیادہ تر رائج رہا ہے۔ سرسید کی مختلف تحریروں میں درسِ نظامی پر تبصرہ ملتا ہے جس میں انہوں نے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اس نظامِ تعلیم کی درسیات میں ترمیم واصلاح پر زور دیا ہے۔ انہوں نے درس نظامی سے متعلق اپنے ایک خصوصی مضمون میں اس کے تحت پڑھائے جانے والے تمام مضامین اور ان کی مقررہ کتب کی تفصیلات پیش کر کے اہلِ علم سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ اسے ملاحظہ کر کے خود فیصلہ کریں کہ موجودہ حالات میں یہ نصاب بعینہٖ مفید ہے یا اس میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے۷۔ مزید براں مدارس سے سرسید کی ہمدردی اس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ مدرسہ دیوبند کی مذکورہ بالا سالانہ رپورٹ کو دیکھ کر انہوں نے اس پر سخت تعجب ظاہر کیا کہ یہ مدرسہ جہاں دینی علوم کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھایا جاتا اور ''جس میں مولوی محمد قاسم صاحب سا فرشتہ سیرت شخص نگراں ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب سا شخص 'مدرّس ہے'' مالی خرابی و کمزوری کا شکار ہے۔ یہ مسلمانوں کی بے حسی، بے توجہی وغفلت کی وجہ سے ہے۸۔ مدرسہ کی مالی حالی کی خرابی پر افسوس و تعجب کے اظہار کے ساتھ محسنِ قوم وملت نے اہلِ قوم سے یہ اپیل بھی کی کہ وہ اسے مالی تعاون دینے میں فراخ دلی سے کام لیں۔ یہ اپیل خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''ہماری غرض اس تمام تحریر سے مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلانا ہے کہ ان کے دونوں کام دین و دنیا کے سب خراب و ابتر ہیں، ان کو شرم آنی چاہئے کہ ان کے مدرسہ اسلامی دیوبند کا کیا حال ہے۔ سب کو چاہئے کہ اس مدرسہ کی ایسی مدد کریں اور ایسی اعلیٰ ترقی پر پہنچائیں کہ جو اسلام کی رونق وشان کا نمونہ ہو''۹۔

واقعہ یہ کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب لاخلاق میں مدرسہ دیوبند سے متعلق صرف سرسید ہی کے مضامین وتبصرے نہیں شائع ہوتے تھے، بلکہ ان کے مدیر محترم ان میں دوسروں کی تحریروں کے بھی بخوشی شریک شاعت کرتے تھے۔ اس ضمن میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع شدہ مولوی شوکت حسین (حیدرآباد) کے مضمون کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے انہوں نے ستمبر ۱۸۹۷ء میں خاص طور سے مدرسہ میں دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے مالی اپیل کے طور پر لکھا تھا۔ اس کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

''الحاصل زمانۂ دراز سے باوجود ایک غیر مستقل اور جزوی آمدنی کے یہ مدرسہ (دیوبند) ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ ترقی یافتہ حالت ہی کے ساتھ قایم چلا آتا ہے اور یہ بے شک کسی مقبول دعاء ہی کا اثر ہے کہ اب تک ایک مختصر مکان بھی مدرسہ نے بطور خود عمیر کرلیا ہے۔ کچھ کتب خانہ بھی ہوگیا ہے، جہاں تک ہوسکتا ہے طلبہ کو بھی بھوکوں مرنے نہیں دیتا اور جیسے کچھ بھی ہر سال حافظ، مولوی اور عالم بھی بناتا رہتا ہے۔ غرض کہ ہندوستان میں اس وقت یہی ایک مدرسہ ہے جو تمام مدارس کے مقابل ہر ایک پہلو سے ممتاز اور ہماری کوششوں اور تائید سے مستفیض ہونے اور فائدہ پہنچانے کی قابلیت رکھنے والا نظر آتا ہے''۱۰۔

اس دور کا دوسرا دینی تعلیمی ادارہ ندوۃ العلماء تھا۔ اس سے زمانۂ قیام ہی سے سرسید کے روابط کے شواہد ملتے ہیں۔ دینی تعلیم کے ایک مرکز کی حیثیت سے ندوۃ العلماء ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں وجود میں آیا، لیکن مجلس ندوۃ العلماء (جس کی تشکیل ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام، کانپور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہوئی تھی) کی سرگرمیاں اس سے کئی سال قبل کانپور سے جاری ہوچکی تھیں۔ اس ضمن میں اس کا اولین جلسہ (جو ۲۲۔۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہوا تھا) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اہم بات یہ کہ مہتمم جلسہ مولانا محمد علی مونگیری کی جانب سے اس کا دعوت نامہ جدید تعلیم کے علم بردار اور اس کی اشاعت میں پوری طرح سر

گرداں رہنے والے سر سید علیہ الرحمۃ کو بھی بھیجا گیا تھا۔ تاریخ ندوۃ العلماء کے مولفِ گرامی اس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور اس تحریک کے داعیوں کو قریب کرنے کے لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اس طبقہ کے با اثر حضرات سے رابطہ پیدا کیا اور انہیں اس اجلاس کی دعوت دی۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء نے اس سلسلہ میں سر سید احمد خاں کو جو خط لکھا تھا اس کا مفصل جواب سر سید نے دیا اور ندوۃ العلماء کے مقاصد سے دلچسپی کا اظہار فرمایا، نیز انہوں نے وہ تجاویز پیش کیں جو خود ندوۃ العلماء کے داعیوں کے پیشِ نظر تھیں"۱۱۔

جلسہ کے انعقاد کی اطلاع ملنے کے بعد سر سید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں "عظیم الشان علمی جلسہ" کے عنوان سے مہتمم مدرسہ فیض عام (جناب الٰہی بخش) کی طرف سے اس جلسہ کے انعقاد کی تفصیلی خبر بھی شائع کی تھی۱۲۔ سر سید خود تو اس میں شریک نہ ہو سکے، لیکن اس موقع پر پیش کرنے کے لئے انہوں نے ایک تفصیلی پیغام ناظمِ جلسہ کے نام خط کی صورت میں ارسال کیا تھا۔

ایم۔اے۔او کالج کے اساتذۂ کرام میں پروفیسر عربی و فارسی مولانا شبلی نعمانی اور ناظمِ دینیات مولانا عبد اللہ انصاری جلسہ میں شریک ہوئے تھے اور اس کے اجلاسوں کی کاروائی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ جلسہ کے روح رواں علی گڑھ کے ممتاز عالم مولانا لطف اللہ (استاد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) تھے جنہیں دو (اول و سوم) اجلاسوں کی صدارت کا شرف حاصل ہوا۔ پہلے اجلاس میں مولانا عبد اللہ انصاری اور دوسرے میں مولانا شبلی نے تحریکِ صدارت پیش کی تھی۔ پہلا اجلاس طلبہ میں اسناد کی تقسیم کے لئے وقف رہا، بقیہ اجلاسوں میں ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد، دینی تعلیم کے نظام کی اصلاح و ترقی، نصاب میں ترمیم و اصلاح اور مجوزہ نئے تعلیمی ادارہ سے متعلق تقریریں ہوئیں، تجاویز پیش کی گئیں اور ان پر بحث و مباحثہ ہوا۱۳۔

اس موقع پر سر سید نے اپنا جو پیغام ناظم جلسہ کے نام خط کی صورت میں بھیجا تھا وہ بقول سر سید "کسی مصلحت سے علمائے کرام کے سامنے پیش نہیں ہو سکا"۱۴۔ لیکن یہ مختلف اعتبار سے بڑی اہمیت و معنویت کا حامل ہے۔ اس اہم خط کا مکمل متن (تین صفحات پر مشتمل) تاریخِ ندوۃ العلماء (حصہ اول) میں بھی انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ جلسہ کے مقاصد (علوم اسلامیہ کے احیاء و تحفظ اور علماء کے باہمی اختلافات کے ازالہ کی تدابیر پر غور و فکر) کو "نہایت عمدہ و مفید" قرار دیتے ہوئے سر سید نے یہ دعاء بھی کی تھی: "خدا تعالیٰ ان میں کامیاب کرے اور خدا تعالیٰ ہمارے زمانے کے علماء کو سلفِ صالح کی پیروی نصیب کرے اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کی عداوت ان کے دل سے دور کرے"۔ اس خط کے توسط سے سر سید نے علماء کو جو پیغام دینا چاہا تھا اس کا لبِّ لباب یہ تھا کہ جدید علوم و فنون بالخصوص جدید فلسفہ و سائنس کی تعلیم سے طلبہ کے عقاید میں جو خلل و فساد واقع ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے وہ اس علم کلام سے دور نہیں ہو سکتا جسے عباسی خلافت کے زمانے میں مسلم متکلمین نے یونانی فلسفہ کے نقصانات کے ازالے کے لئے ایجاد کیا تھا اور نہ ہی قدیم علمِ کلام کی تعلیم سے ان اعتراضات کے رفع کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے جو جدید فلسفہ و سائنس کی روشنی میں اسلامی عقاید و تعلیمات پر وارد جاتے ہیں۔ کیا اس صورتِ حال میں جدید علم کلام کے ایجاد اور اسی کے مطابق درسیات تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟۔ یہ نکات خود سر سید کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"مگر ایک اور امر جو سب سے ضروری اور مقدم ہے، میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک زمانہ مسلمانوں پر ایسا گذرا ہے جس میں بجز تحصیل علومِ دین کے اور کسی علم سے سروکار نہ تھا، جس کے سبب علومِ دین کی ہزاروں کتابیں

حدیث، تفسیر، فقہ، اسماءِ رجال، اصول حدیث، اصولِ فقہ وغیرہ موجود ہو گئیں۔

اس کے بعد ایک زمانہ آیا جس میں حکمت وفلسفہ یونان کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور اس کے سبب عقایدِ مذہبی میں بہت کچھ خلل واقع ہوا یا واقع ہونے کا اندیشہ ہوا۔ اس وقت علماء نے مذہبِ اسلام کی تائید پر کمر باندھی اور علم ایجاد کیا اور اسلام کی نصرت کی۔ مگر اب وہ زمانہ بھی گیا اور جدید فلسفہ اور جدید حکمت اور جدید علوم حکمیہ پیدا ہو گئے اور اس کے مسائل، اور جو جدید تحقیقاتِ علوم طبعی کی اس میں ہوئی ہے وہ بہت زیادہ مخالفِ مسائل موجودہ اسلام کی ہے۔ اور ان جدید علوم کا شیوع ہوتا جاتا ہے اور کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہو سکتا۔ اگلے زمانہ کے عالموں نے بھی حکمت اور فلسفہ یونان، بلکہ منطق کے پڑھنے کو بھی حرام قرار دیا تھا، مگر اس سے کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے اس کو پڑھا اور لاچار خود علماء نے اس کی تحصیل کی اور علمِ کلام ایجاد کیا۔ (اب) جو مسائلِ حکمت وفلسفہ وطبیعات کے علومِ جدیدہ کے ذریعہ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کے لئے وہ علمِ کلام جو یونانی فلسفہ وحکمت کے مقابل بنایا گیا تھا کافی نہیں ہے اور تفاسیرِ قرآن مجید وحدیث شریف اور دیگر کتبِ مصنفہ اہلِ اسلام میں اس کے متعلق کچھ پایا نہیں جاتا اور اس سبب سے الحاد وزندقہ مسلمانوں میں پھیلتا جاتا ہے جو نہایت سخت وبا ہے جس کی روز بروز ترقی ہونے کی امید قوی ہے۔ پس اس کا کیا علاج ہے''۱۵۔

حقیقت یہ کہ سر سید مسلمانوں میں جدید فلسفہ و سائنس کی ترویج کی ابتداء سے ہی علماء کو اس جانب متوجہ کرتے رہے اور جدید فلسفہ و سائنس کے حوالے سے مذہب ومذہبی عقائد کے بارے میں ابھرنے والے شکوک وشبہات کے ازالہ کی خاطر وہ علماء میں نئے علمِ کلام کی ایجاد وترقی کی تحریک پیدا کرتے رہے، لیکن اس سمت میں کوئی پیش رفت نہ ہونے پر انہیں افسوس رہا۔ دسمبر ۱۸۹۴ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس (منعقدہ علی گڑھ) سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا:

''میں نے ابتداء سے یعنی جب سے کہ زبانِ انگریزی اور علوم جدیدہ کے مسلمانوں میں رائج ہونے کی کوشش کی، اس بات کی خواہش کی ہے کہ ہمارے زمانے کے علماء اس مشکل امر پر متوجہ ہوں اور علومِ جدیدہ کے مقابلہ میں علمِ کلام پیدا کریں، مگر افسوس کہ کسی نے اس پر توجہ نہیں کی ہے''۱۶۔

بہر حال مجلسِ ندوۃ العلماء کے اولین جلسہ کے انعقاد کے بعد منتظمین نے اس کی روداد (حصہ اول) سر سید کو ارسال کی تو اس کے باوجود کہ ان کا پیغام جلسہ میں پڑھ کر نہیں سنایا گیا تھا) اس کے جواب میں اظہارِ تشکر کرتے ہوئے یہ بھی تحریر کیا: ''ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے، اس کو چلنے دینا چاہئے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ میں اس کی رسید اخبار میں چھاپوں گا اور نواب محسن الملک مولوی سید علی مہدی کانفرنس کے اجلاس میں ایک رزولیوشن پیش کریں گے''۱۷۔ اس کے واضح شواہد موجود ہیں کہ سر سید نے دونوں وعدے پورے کر دکھائے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں روداد جلسہ کی وصول یابی کی خبر شکریہ کے ساتھ شائع کی ۱۸۔ اور کانفرنس کے کے اجلاس (منعقدہ بتاریخ ۲۷۔۲۹ر دسمبر ۱۸۹۴ء بمقام علی گڑھ) میں تحریک ندوۃ العلماء کی تائید میں سر سید کے رفیقِ خاص نواب محسن الملک نے رزولوشن پیش کیا جو بالاتفاق منظور ہوا۔ رزولیوشن کے الفاظ یہ تھے:

''اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جلسہ ندوۃ العلماء، جو مقام کانپور منعقد ہوا تھا اور جس میں علماء وکابر دین جمع ہوئے تھے تمام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہے اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقہ تعلیم اور رفع نزاع باہمی نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔ تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے

مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبودی مقصود ہے بدل و جان قلم سے، قدم سے، درم سے مدد کرنی چاہئے''۱۹۔

مزید برآں مذکورہ رزولوشن پیش کرتے ہوئے نواب صاحب نے جو تقریر کی اس کی کافی تحسین و توصیف ہوئی۔ صدر اجلاس محمد شاہ دین اور دیگر ممبران کانفرنس کی تجویز کے مطابق مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اسے (مع دوسری تائیدی تقاریر) علیحدہ رسالہ کی صورت میں ۱۸۹۵ء میں طبع کرا کے تقسیم کا اہتمام کیا تھا۲۰۔

اسی سلسلہ میں یہ اضافہ بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مذکورہ تاریخی جلسے سے تقریباً دو ماہ قبل تحریک ندوۃ العلماء کے ایک اہم رکن مولانا حکیم سید عبدالحئی (جو ناظمِ جلسہ کے دستِ راست تھے اور بعد میں ایک طویل عرصہ تک ندوۃ العلماء کے ناظم بھی رہے) نے سرسید کو پند و نصائح پر مشتمل ایک خط ارسال کیا تھا جس میں انہیں خاص طور سے سلفِ صالحین کے طریقہ پر چلنے کی نصیحت کی تھی۔ اس کے جواب میں سرسید نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ بھی قابل ذکر ہے۔ خود انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

مولانا حکیم جناب مولانا و مخدومنا مولوی سید عبد الحئی صاحب، ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

''آپ کا نوازش نامہ مملو از نصائح ارجمند پہنچا۔ میں آپ کی عنایت و ہمدردیِ اسلامی کا نہایت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری دعاء اپنے لئے اور آپ کے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے خدائے کریم سے یہی ہے کہ

''اھدنا الصراط المستقیم صراط الّذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین.''۲۱

آخر میں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مدارس سے سرسید کے روابط مضبوط کرنے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (جو پہلے سین ٹیفک سوسئٹی اخبار کے نام سے موسوم تھا) کا اجراء مارچ ۱۸۶۶ء میں عمل میں آیا۔ اس دولسانی اخبار میں مدارس و دینی اداروں سے متعلق خبروں، ان کی سالانہ رودادوں پر تبصرے، اہلِ مدارس کی وفات پر تعزیتی تحریروں اور مذہبی تعلیم و مدارس کے نظام تعلیم اور اس کی اصلاح و ترقی سے متعلق مضامین کی اشاعت مستقل ہوتی رہتی تھی۔ یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ سرسید اور ایم۔ اے۔ او کالج سے متعلق اہل مدارس کے کچھ ذہنی تحفظات کے باوجود معروف مدارس کے ارباب انتظام اپنے مدرسوں کی سالانہ روداد یا کارکردگی کی تفصیلات اور ان میں منعقد ہونے والے پروگراموں کی رپورٹیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مدیر محترم سرسید کو ارسال کرتے تھے اور وہ انہیں بخوشی شائع کرتے تھے۔ مزید براں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں وفات پانے والی شخصیات پر سرسید کی جو تعزیتی تحریریں شائع ہوئی ہیں ان میں سے متعدد دینی تعلیم کے ماہرین یا مدارس میں تدریس و انتظام سے وابستہ علماء سے تعلق رکھتی ہیں، جیسا کہ پروفیسر اصغر عباس کی مرتبہ کتاب ''سرسید کی تعزیتی تحریریں'' (جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع شدہ مضامین پر مبنی ہے) سے واضح ہوتا ہے۲۲۔ اسی ضمن میں یہ ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کی دہلی کے آثار قدیمہ سے متعلق رکھنے مشہور تحقیقی تصنیف ''آثار الصنادید'' کا ایک حصہ مختلف علوم و فنون کے میدان میں ممتاز شخصیات کے احوال و کوائف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ''علماء دین'' کی سرخی کے تحت ۲۹ علماء کرام کا تذکرہ ہے۔ اہم بات یہ کہ ان میں بعض ان علماء کا ذکر خیر بھی شامل ہیں جو سرسید کے ناقدین میں سے تھے۲۳۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ مسلمانوں میں قدیم و جدید تعلیم کی اشاعت اور ان کے تعلیمی اداروں کی توسیع و ترقی کے لئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (جس کے سرسید احمد خاں بانی

سکریٹری رہے ہیں) کی خدمات بہت ہی مفید اور قابلِ قدر رہی ہیں۔ان خدمات کا ایک وقیع حصہ دینی تعلیم کے فروغ اور مدارس کے نظام کی مضبوطی و بہتری اور جدید تعلیم کے اسکولوں و کالجوں میں مسلم طلبہ کے لئے مذہبی تعلیم کے اہتمام سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ اس کی تفصیلات سالانہ اجلاسوں کی رودادوں، انوار احمد مارہروی کی مرتبہ ''مرقع کانفرنس''[۲۴] اور پروفیسر اختر الواسع کی کتاب (سرسید کی تعلیمی تحریک۔آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجمالی مطالعہ) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں[۲۵]۔

مختصر یہ کہ معاصر دینی مدارس سے سرسید کے ربط وتعاون کا یہ ایک مختصر جائزہ ہے جو خاص طور سے دیوبند ولکھنؤ کے معروف دینی اداروں کے حوالے سے پیش کیا گیا۔اگر معاصر ماٰخذ (بالخصوص علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وتہذیب الاخلاق کی قدیم فائلوں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی رودادوں اور سرسید کے خطوط و خطبات کے مجموعوں) کی چھان بین کی جائے تو اس سے متعلق مزید مواد فراہم ہوسکتا ہے اور مذکورہ مدارس کے علاوہ دوسرے مدارس (بالخصوص پنجاب کے مدارس) سے بھی سرسید کے ربط و تعاون کے شواہد مل سکتے ہیں۔اللہ کرے ادارۂ سرسید کے فرزندوں میں سے کسی کو اس موضوع پر مزید مطالعہ وتحقیق کی توفیق نصیب ہو۔

خلاصہ یہ کہ زیر بحث موضوع پر جو کچھ تفصیلات اوپر پیش کی گئیں ان سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کا دائرہ بہت وسیع تھا، وہ جدید تعلیم کے دلدادہ تھے اور اسی کے ساتھ دینی تعلیم کے قدرداں بھی تھے۔انہوں نے دینی تعلیم کی اشاعت میں مصروف رہنے والے اور مدارس کے نظم ونسق سے منسلک علماء سے ربط قایم رکھنے اور اسے مضبوط کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مزید یہ کہ انہوں نے دینی تعلیم کے مراکز کی اصلاح وترقی کے کاموں میں گہری دلچسپی لی اور اس راہ میں سرگرداں رہنے والوں کو فراخ دلانہ تعاون دیا۔مزید اہم بات یہ کہ وہ ملت کے رہنماؤں یا علماء کے مابین اتحاد واتفاق کے متمنی رہے اور اس کے لئے دعائیں بھی کرتے رہے۔اللہ رب العزت ان کی دینی وملّی خدمات کو قبول فرمائے اور ہمیں ان سے سبق حاصل کرنے کی توفیق عنایت کرے۔آمین ثم آمین۔

☆

حواشی ومراجع

ا۔تفصیلات کے لئے دیکھئے: ظفر الاسلام اصلاحی، مطالعاتِ سرسید (باب دوم۔سرسید اور باہمی انجمنیں۔باہمی ربط وتعاون)، ادارہ علومِ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص۴۰۔۶۴

۲۔اصغر عباس (مرتب)، سرسید کی تعزیتی تحریریں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص ظفر الاسلام اصلاحی، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام اور اس کے اولین نقوش، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء، ص۸۲۔۸۳

۳۔خطوط سرسید، مرتبہ سرراس مسعود، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۱ء، ص۱۷۳۔۱۷۴؛ نور الحسن راشد کاندھلوی، مولانا عبد اللہ انصاری انبیٹھوی، فکر ونظر، علی گڑھ (ناموران علی گڑھ۔خصوصی شمارہ/دوسرا کارواں)، جلد۲۳، ۱۹۸۶ء، ص۴۰۶

۴۔تصفیۃ العقاید، مطبع منشی محمد حیات، میرٹھ، ۱۲۹۸ھ، ص۳: مکتوبات سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص۲۳

۵۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴/ اپریل، ۱۸۸۰ء، ص۴۶۷۔۴۶۸؛ مقالاتِ سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۸/۲۰۵۔۲۰۶

۶۔مقالاتِ سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۷/۲۸۴۔۲۸۵؟

۷۔مقالاتِ سرسید، ۸/۱۰۹۔۱۱۳

۸۔مقالاتِ سرسید، ۷/۲۷۸۔۲۷۹

۹۔ مقالاتِ سرسید، ۷/۲۸۷

۱۰۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۸/ستمبر ۱۸۹۷ء

۱۱۔ محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخِ ندوۃ العلماء، دفتر نظامت، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ۱/۱۱۳

۱۲۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۳/اپریل ۱۸۹۴ء، ص ۳۳۶

۱۳۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۳۲۲۔۳۲۸؛ تاریخِ ندوۃ العلماء، ۱/ ۹۵۔۹۷، ۱۰۳۔۱۰۵

۱۴۔ مقالاتِ سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ۱۲/۲۶۱

۱۵۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۶/اپریل ۱۸۹۴ء، ص ۳۵۸، مقالاتِ سرسید، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۳ء، ۱۲/ ۲۵۹۔۲۶۱؛ تاریخِ ندوۃ العلماء، ۱/۱۱۳۔۱۱۵

۱۶۔ مقالاتِ سرسید، ۱۲/۲۵۹

۱۷۔ خطوط سرسید، محولہ بالا، ص ۱۷۱

۱۸۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۵/دسمبر ۱۸۹۴ء، ص ۱۴۵۸

۱۹۔ مجموعہ رزولیوشن ہائے دہ سالہ [۱۸۸۶ء۔۱۸۹۵ء] محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، مرتبہ سرسید احمد خاں، آگرہ، ۱۸۹۶ء، ص ۵۸؛ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۴/جنوری ۱۸۹۵ء، ص ۲۰

۲۰۔ رزولیوشن در باب تائید ندوۃ العلماء کانپور [معہ اوس کی متعلقہ اسپچوں کے] اجلاس نہم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مقام علی گڑھ، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۵ء، ص ۲

۲۱۔ مکاتیب سرسید، ص ۳۸۸

۲۲۔ اصغر عباس (مرتب)، سرسید کی تعزیتی تحریریں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء

۲۳۔ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید (مرتبہ خلیق انجم)، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی ۔۲۰۰۳ء، ۲/ ۵۱۔۱۱۲

۲۴۔ انوار احمد مارہروی، مرقع کانفرنس، علی گڑھ، ۱۹۳۵ء

۲۵۔ اختر الواسع، سرسید کی تعلیمی تحریک۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجمالی مطالعہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۶۳۔۶۵، ۱۰۲۔۱۰۸

تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسب حال
پھر کیا امید دولت و آرام و احترام
سید کے دل پہ نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

اکبر الہ آبادی

سرسید اور ہندو مسلم اتحاد

عرفات ظفر

ہمارا ملک ہندوستان صدیوں سے امن و آشتی، محبت و رواداری اور اتحاد و ہم آہنگی کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں مختلف ادیان و مذاہب کے ماننے والے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ تہواروں کے موقع پر ایک دوسرے سے گلے ملتے اور انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔ مگر افسوس کہ نفرت اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کی خطرناک روش نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے ملک بھر میں مذہب کی بنیاد پر ہونے والے حادثات میں اضافہ ہوگیا ہے۔ جس کے باعث معاشرے کے سنجیدہ طبقہ میں بے چینی پائی جارہی ہے اور عالمی سطح پر ہندوستان کی شبیہ خراب ہورہی ہے۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان نے زندگی کے مختلف میدانوں میں قابل لحاظ ترقی کی ہے۔ تعلیم، صحت، صنعت، معیشت اور سائنس وٹکنالوجی کے شعبوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ پالیسی کی سطح پر ہندوستان نے مضبوطی کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ لیکن افسوس کہ نفرت، فرقہ پرستی اور تشدد کو لگام لگانے میں ہم بڑی حد تک ناکام رہے ہیں۔ ملک کی اقلیتیں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کررہی ہیں۔ سماج کے دیگر کمزور طبقات کو عدل وانصاف دلانے میں بھی ہماری کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے۔

سماج کے ہوش منداور بیدار مغز افراد نے ہر دور میں ظلم و نا انصافی اور نفرت وتشدد کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور قوم کو اتحاد و اتفاق اور محبت و رواداری کا درس دیا ہے۔ تا کہ ملک کے تمام باشندے امن وسکون کے ساتھ زندگی گزاریں، ملک خوشحال ہو اور ترقی کرے۔ مصلح قوم سرسید علیہ الرحمہ (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) نے بھی اپنے عہد میں ہندو اور مسلمان دونوں کو اتحاد و یکجہتی کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ انھیں تعلیم کو ترقی کا زینہ بنانے کا مشورہ دیا۔ ملک کے نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ تعلیم کی روشنی کو پھیلائیں اور سماج کے اندر سے عصبیت وتنگ نظری اور بغض وعناد کے خاتمہ میں اپنا کردار ادا کریں۔ سرسید کے نزدیک مذہب ان اعلیٰ اخلاقی وروحانی اقدار سے عبارت ہے جو ایثار و محبت اور خدمت خلق کے جذبات کو فروغ دیتے ہیں۔

ہندوؤں سے سرسید کے خاندانی مراسم تھے۔ ان کے نانا نواب فریدالدین خان نے اپنی جائیداد کو نہ صرف اپنے بیٹوں میں تقسیم کیا بلکہ برابر کا حصہ اپنے دیوان لالہ ملوک چند کو بھی دیا۔ اسی طرح سرسید ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت کرتے اور اپنے ہندو دوستوں کو اس کی مبارک باد دیتے۔ سرسید نے غازی پور میں جب مدرسہ قائم کیا تو اس کی سنگ بنیاد کے لئے انھوں نے راجہ دیونارائن سنگھ اور مولانا محمد فصیح دونوں کو مدعو کیا۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے کہ سرسید کے پوتے سرراس مسعود، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی رسم بسم اللہ خوانی ہورہی ہے اور ننھے مسعود اپنے دادا کے دوست راجہ جے کشن داس رئیس مراد آباد کی گود میں بیٹھے ہیں اور اسی حالت میں مولوی صاحب انھیں بسم اللہ شریف اور قل ھو اللہ شریف کا پہلا درس دے رہے ہیں۔ (۱)

سرسید نے ہمیشہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ انگریزوں کے دور حکومت میں جب وہ عدالت عالیہ میں ملازم تھے، سبھی طبقات کے مقدمات ان کی عدالت میں آتے تھے لیکن انھوں نے جس بے تعصبی اور کشادہ دلی سے اپنے فرائض انجام دیئے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو عوام ان پر بھروسہ رکھتی تھی۔ اور ان کے غیر مسلم معاصرین انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد جب وہ بنارس

سے روانہ ہونے لگے تو وہاں کے ہندو مسلم رؤساء اور انگریز حکام نے ان کے لئے الوداعیہ تقریب منعقد کی جس میں ان کی سرکاری اور قومی خدمات کے علاوہ ان کے بے لاگ انصاف اور غیر متعصبانہ فیصلوں کی نہایت تعریف کی۔

سرسید ہندو مسلم اتحاد اور مذہبی رواداری کے زبردست حامی تھے۔ وہ جہاں بھی رہے سماجی اصلاح اور مذہبی رواداری پر مبنی افکار و خیالات کو عام کرتے رہے۔ بنارس میں اپنی ملازمت کے دوران سرسید آریہ سماج تحریک کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴-۱۸۸۳ء) کو اپنے گھر بلا کر ان سے ویدوں کے اشلوک سنتے تاکہ مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں وہ آریہ سماجی تحریک کے افکار سے مستفید ہوں۔ سوامی دیانند سرسید کو ''مہارشی'' کے لقب سے پکارتے اور اکثر علی گڑھ آکر ان سے ملاقات کرتے تھے۔

وطن دوستی اور قومی یکجہتی کے تعلق سے سرسید کے بعض اقوال ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ امتداد زمانہ کے باوجود ان کا حسن اور ان کی معنویت برقرار ہے۔ ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے سرسید نے فرمایا: ''ہندوستان ایک دلہن کے مانند ہے۔ جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں''۔ (۲) اسی طرح اتحاد و اتفاق، آپسی بھائی چارگی، خلوص و ہمدردی اور اخوت و محبت سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار سرسید نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

''میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ اس کہنے کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیوں کہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسری کو بائیں آنکھ کہیں گے۔ مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں۔ اے کاش میرے صرف ایک ہی آنکھ ہوتی کہ اس حالت میں، میں عمدگی کے ساتھ ان کو اس ایک آنکھ سے تشبیہ دے سکتا۔ (۳)

ہندو مسلم اتحاد کی اس سے بہتر ترجمانی نہیں ہو سکتی۔ یہ تشبیہ محض ایک جذباتی تقریر نہیں ہے بلکہ سرسید کے اس بنیادی فکر کی آئینہ دار ہے جسے وہ ملک کے اتحاد و سالمیت کے لئے ناگزیر سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اتحاد، ایثار اور تحمل کے بغیر ملک کو آزادی اور استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اسی افتراق، تنگ نظری اور مفاد پرستی کے باعث انگریز ہمیں غلام بنانے میں کامیاب ہوئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی جہالت، پستی اور زبوں حالی کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور یہ محسوس کیا کہ جدید تعلیم کے بغیر اس سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ اور پھر مسلم معاشرہ کی اصلاح و ترقی کو انھوں نے اپنا مطمح نظر بنا لیا۔ چند کوتاہ بیں لوگوں نے ان کی انھیں کوششوں کو غلط فہمی کی بنیاد پر ہندو مخالف سمجھ لیا اور ان پر فرقہ پرست ہونے کا الزام لگایا۔ حالانکہ سرسید کی تمام تحریریں اور تقریریں اس شائبہ سے نہ صرف پاک ہیں بلکہ ان میں قومی یکجہتی، اجتماعی فلاح و بہبود اور اعلیٰ انسانی اقدار کا پیغام ملتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد اور علی گڑھ کالج کے سیکولر کردار کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید اپنے ہندو دوستوں سے یوں مخاطب ہیں:

''میرے دوستو! مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا ہوا یہ تھا کہ مسلمان روز بروز ذلیل اور محتاج ہوتے جارہے ہیں۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں سے مہیا کی گئی تھی۔ اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے۔ اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے، فرض کرو دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقت ور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے۔ پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں۔ (۴)

سرسید نے اپنی اس تقریر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں

بھائی یعنی ایک ماں کی دو اولاد سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ان متعصب مؤرخین اور سیاستدانوں کے لئے غور کرنے کا مقام ہے جو سرسید کو فرقہ پرست یا علیحدگی پسند کہتے ہیں۔ مسلمان صدیوں تک ہندوستان کے حکمراں رہے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تعمیر و ترقی میں انھوں نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اردو جیسی شیریں زبان ان دونوں قوموں کے اختلاط سے وجود میں آئی۔ اسی طرح چند معاملات میں ہندوستانی مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ جسکو آزادی کے بعد ملک کی دستور ساز اسمبلی کے اراکین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان اس ملک میں فخر کے ساتھ زندگی گزاریں اور اپنے ہندو بھائیوں کے شانہ بشانہ ملک کی آزادی اور اس کی تعمیر نو میں حصہ لیں۔

سرسید کی قومی یکجہتی اور ان کے کالج کے سیکولر کردار کی اس سے عمدہ مثال کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے دروازے تمام مذاہب کے طلبہ کے لئے یکساں کھلے رہے ہیں۔ کالج کا پہلا گریجویٹ ایشوری پرشاد ایک ہندو تھا اور دوسرے اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور فارغ التحصیل امبا پرشاد تھے۔ کالج کے ہیڈ ماسٹر سڈنس اور نائب ہیڈ ماسٹر لالہ بیج ناتھ پرشاد تھے۔ اساتذہ میں شری جادو چندر چکرورتی ریاضی کے استاد تھے اور شری شیو شنکر سنسکرت پڑھاتے تھے۔ یہی نہیں کالج کی انتظامیہ میں بھی تمام مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ کالج کے کیمپس میں ہندو اساتذہ اور طلبہ بغیر کسی بھید بھاؤ کے رہائش پذیر رہتے ہیں۔

اس پس منظر میں اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کالج کا بنیادی مقصد اگرچہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کو عام کرنا تھا، تاہم اس کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے لئے وا تھے۔ فرقہ پرست اور ناعاقبت اندیش عناصر سے بے پروا ہوکر سرسید نے ایثار و اخلاص اور قومی یکجہتی کے اپنے پیغام کو پھیلانے کے لئے ہر سو جتن کیے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندوستان کی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر رہیں۔ وہ کسی ایک فرقے کی ترقی کو ملک کی ترقی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے اپنے قول و عمل سے اس کی گواہی دیتے رہے۔

سرسید نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب لانے اور انھیں ایک لڑی میں پرونے کا کوئی ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ تعلیم کے ساتھ قومی اتحاد کو بھی وہ اپنے مشن کا حصہ سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو خطاب کر کے یوں فرماتے ہیں:

"اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں اسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے۔ ہندو اپنا ملک بھول گئے، اپنے دیس سے پردیس ہونے کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا اور ہندوستان ہی کو انھوں نے اپنا وطن سمجھا۔ ہم نے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا اور اپنے سے پیش قدموں کی طرح ہم بھی اس ملک میں رہ پڑے۔ پس اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوگئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے سے مشابہ ہوگئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کرلیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں۔ پس اگر ہم اس حصے سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے قطع نظر کرلیں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبود ممکن ہے۔" (۵)

سرسید کے یہ الفاظ اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی ناگزیریت پر دال ہیں۔ سرسید نے نہ صرف اس اتحاد و اتفاق کی پرزور حمایت کی ہے بلکہ اس کی حصولیابی کے لیے وہ خدائے بزرگ و برتر کے سامنے دست بدعا بھی نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ان کے یہ الفاظ:

"مجھے امید ہے کہ ہندوستان میں جس میں خدا نے ہم کو اور ہمارے ہندو بھائیوں کو آباد کیا ہے جس سے اس کا منشا یہ پایا جاتا ہے کہ ہم دونوں گروہ بھائی ہوکر اور ایک دوسرے کو بھائی سمجھ کر ایک دوسرے کی مدد کریں۔ .... میری دعا ہے کہ خدا ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی مدد کا خیال پیدا کرے اور ایک کو دوسرے کا حامی کرے"۔ (۶)

سرسید کو جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ قوم ان کی دعوت پر گوش برآواز نہیں ہو رہی ہے اور ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے تو وہ قوم کے رویہ پر کف افسوس ملتے ہیں اور اپنا لہجہ قدرے سخت کرتے ہوئے قوم سے مخاطب ہیں:

''اے ہندوؤں اور مسلمانوں! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں''۔(۷)

ہندوستان مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے۔ یہاں کئی مذاہب اور مختلف افکار و نظریات کے لوگ ایک ساتھ رہتے اور بستے ہیں۔ سرسید ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچتے اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ہمیشہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کی عزت و احترام کرنے کی تلقین کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ ''وہ لوگ جو سچے، پاکباز اور تقویٰ شعار ہیں گو وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں ویسے ہی تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے ہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ''۔

سرسید زندگی بھر اخوت و محبت، مصالحت و مفاہمت، عمدہ اخلاق، اعلیٰ کردار ایک دوسرے کے جذبات کا احترام، باہمی تعاون اور اخلاص و مروت پر مبنی افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل رہے۔ ملک میں امن و امان قائم رہے اور مذہبی رواداری کی فضا مکدر نہ ہو اس کے لئے سرسید علیہ الرحمۃ مسلسل تدابیر اختیار کرتے۔ ہندوستان میں گائے کو لے کر فسادات کی شروعات برطانوی عہد ہی سے ہو چکی تھی۔ اس مسئلہ پر سرسید نے نہایت جرأت مندانہ انداز میں اپنی رائے ظاہر کی، وہ لکھتے ہیں:

''ہماری مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے''۔(۸)

یہ تھی سرسید کے اعلیٰ کردار، نیت صالح اور ان کے جذبہ انسانیت کی ایک ادنی سی مثال۔ چونکہ سرسید امن پسند، صلح و رواداری کے خوگر اور اتحاد و یکجہتی کے پیامبر تھے۔ اس لئے انھوں نے گائے کی قربانی کو برادران وطن کی دل آزاری کا سبب تصور کیا اور مسلمانوں کے اس پر اصرار کو ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ قرار دیا۔

اس طرح سرسید تاعمر ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور ہندوستانی معاشرے میں موجود مذہبی رواداری کی اعلیٰ اقدار کو قائم رکھنے کے لئے کوشاں رہے۔ ان کی تحریروں میں جہاں جہاں قوم کا لفظ آیا ہے اکثر جگہ ان کی مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔

اتحاد و مفاہمت کی جتنی ضرورت عہد سرسید میں تھی اس سے کہیں زیادہ اس کی حاجت آج کے ہندوستانی معاشرہ کو ہے۔ موجودہ ہندوستانی سماج نفرت و تعصب اور تنگ نظری و عدم تحمل کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ ظلم و ناانصافی کے خلاف اٹھنے والی آواز مدھم پڑ رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ سرسید کے قومی افکار و نظریات کو عام کیا جائے۔ ان کے پیغام پر عمل کرتے ہوئے باہمی گفت و شنید کے دروازے وا کئے جائیں۔ ہندو بھائیوں کے ذہنوں میں بیٹھی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔ آپسی میل جول اور دیگر طبقات کے ساتھ سماجی سروکار کو بڑھایا جائے۔ دوریوں کو قربتوں میں تبدیل کیا جائے تاکہ کدورتیں دور ہوں۔ وقت پڑنے پر دل کھول کر ان کی مدد کی جائے۔ باہمی تعاون کے دیگر پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ اسی طرح ملی قائدین اور امت کے دانشور افراد اپنے مسائل و مطالبات کو لے کر ملکی حکمرانوں سے بات چیت کریں۔ تاکہ برف پگھلے اور فضا میں خوشگوار تبدیلی آئے۔ ہندو اور مسلمان دونوں تلخیوں کو بھلا کر ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھیں، تاکہ ملک میں خوشحالی اور استحکام آئے اور عالمی منظرنامے پر وطن عزیز ایک ابھرتی طاقت بن کر نمودار ہو۔

حوالہ جات: (۱) مکمل مجموعہ لکچرز، مرتبہ مولوی امام الدین گجراتی، مطبع لاہور، ص: ۴۴۷-۴۴۹، (۲) ایضاً، ص: ۱۵۱، (۳) ایضاً، ص: ۲۹۱، (۴) ایضاً، ص: ۲۳۲، (۵) ایضاً، ص: ۱۵۰-۱۵۱، (۶) ایضاً، ص: ۲۰۷، (۸) مطالعۂ سرسید احمد خان، مولوی عبدالحق، ص: ۹۲

مدرسۃ العلوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سفر

توقیر راہی

کچھ عبقری، نابغہ، یکتائے زمانہ اور کرشمائی شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں، جو کہ تاریخ کو اپنی تاریخ رقم کرنے پر مجبور کردیتی ہیں، پھر وہ رہتی دنیا تک تاریخ کا روشن باب تصور کی جاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ **سرسید احمد خاں** کے بارے میں واقعہ رونما ہوا ہے، جو کہ آج سے تقریباً دوسو سال قبل ۱۸۱۷ء میں ہندوستان کی سرزمین میں عدم سے وجود میں آتے ہیں اور ایسے کارہائے نمایاں انجام دے جاتے ہیں کہ بڑی شخصیات انگشت بدنداں ہیں، زیرِ لب مسکراہٹیں ہیں، دانشوروں کی تحریریں زیر بحث ہیں اور مدح سرائی کی شہنائیاں بج رہی ہیں، بھلا ایسا کیوں نہ ہو؟ ایسا شخص جو بیک وقت ادیب بھی ہیں اور مصنف بھی، تاریخ داں بھی ہیں اور تاریخ نویس بھی، مزید برآں تاریخ ساز بھی، قانون داں بھی ہیں اور مصنف بھی، ماہر تعلیم بھی ہیں اور قوم وملت کے ماہر نفسیات ونباض بھی، جہاں ان میں بصارت وودیعت کردہ ہے وہیں بصیرت وحکمت بھی، جہاں آپ حاکم ہیں، وہیں ملت حکیم بھی۔ جہاں آپ مدبر ومفکر ہیں، وہیں محقق ومصلح قوم بھی۔ آپ نے جہاں بیش بہا نظریات پیش کی ہیں وہیں عملی مظاہرہ بھی۔ ورنہ حالی ماضی کا رونا روتے رہے، اکبر حال پر تنقید کرتے رہے اور اقبال نظریات کے آفاق میں گم۔

ان دنوں دوسو ایک سالہ جشن ولادت کی دھوم مچی ہے، اندرونِ ملک اور بیرونِ ممالک میں تقریبات منعقد ہورہی ہیں، علیگ مع غیر علیگ برادران جشن میں مشغول ومنہمک ہیں، راقم بھی ہر سال کی طرح متمنی ہے کہ کہیں فرض کفایہ ادا کیا جائے۔ یوں تو قدر مردم بعد مردن ہوتی ہے، جس کا گلہ وشکوہ غالب کرتے رہے، جس کے شاکی میر تقی میر رہے، لیکن سرسید اپنی رہتی زندگی میں شہرتِ دوام حاصل کر چکے تھے، یہ الگ بات ہے کہ خوشہ چینیوں کی کمی نہیں رہی، دراصل فن یا فنکار ترقی کی منزلیں تب ہی طے کرتا ہے، جب اس پر تبصرہ وتنقید کا ہتھوڑا چلتا ہے، اس معاملہ میں سرسید احمد خاں بہت خوش نصیب ثابت ہوئے۔ انھوں نے قوم وملت کو جوں جوں بیدار کرنے کی کوشش کی، دین ودنیا میں کامیاب ہونے کی دعوت دی۔ پھر کیا تھا؟ عداوت کا بگل بجنے لگا، خیر خواہ بد خواہ بن گئے، لیکن آہنی وکرشمائی شخص نے نہ کبھی ہمت ہاری، نہ مضمحل وہ مضطرب ہوئے بلکہ حالات کا مقابلہ خندہ روئی سے کیا۔ یہی نہیں اپنے ویژن ومشن میں ڈٹے رہے، یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کا دامن ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا۔ قوم وملت جو کہ پستی کی انتہا میں پہنچ گئی تھی، جس پر مایوسی کی گھنگور گھٹا چھا گئی تھی، ایک طرف حکومت جانے کا ملال، دوسری جانب دین پر بھی یلغار، روایتی تعلیم سے محبت، جدید تعلیم کی تشویشات۔ ایسی صورت حال کہ قوم ادھیڑ بن میں مبتلا ہوگئی تھی۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں، مولانا قاسم نانوتوی نے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کے ذریعے روایتی تعلیم کی شمع روشن کی، وہیں سرسید احمد خاں علیہ الرحمہ نے جدید علوم وفنون کی رہبری ''مدرسۃ العلوم'' کے ذریعے ۱۸۷۵ء میں کی، جو کہ آج ترقی کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔ دونوں شخصیتیں اور دونوں ادارے الگ الگ تحریک ثابت ہوئے، ایک روایتی تعلیم

کے علمبردار تو دوسرے جدید تعلیم کے رہنما۔ آگے دونوں اداروں کے درمیان بڑی خلیج پیدا ہوگئی، لہٰذا پل کا کردار ادا کرنے لیے ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' کی بنیاد ۱۸۹۸ء میں رکھی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ کون ادارہ کتنا کامیاب ہوا، آنکھوں سے اوجھل نہیں۔ آج کا دور جدید علوم وفنون، سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے اور اس سے ہم آہنگی وقت کی اشد ضرورت ہے۔ دین اسلام آفاقی ہے، لہٰذا آفاقی علوم و فنون کی تعلیم ضروری ہے۔ مزید برآں، افہام وتفہیم کے لیے زبان کا بہت بڑا رول ہوتا ہے اور زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس تعلق سے سرسید احمد خان نے مروجہ زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی وکالت کی۔ بڑے ادیب وشاعر، دانشور ومفکر آنے والی آہٹوں کو قبل از وقت محسوس کرلیتا ہے، سرسید احمد خاں نے وقت کی نزاکتوں کو بھانپ لیا، چونکہ قوم وملت کے نباض تھے اور سینے میں بے پناہ درد رکھتے تھے، ایسا درد جو انھیں سونے نہیں دیتا تھا، وہ رات کو نہیں، بلکہ دن کو قوم وملت کا سنہرا خواب دیکھ رہے تھے، آخر کار ان کا خوب شرمندۂ تعبیر ہوا، قوم وملت کو تعلیم کی نئی روشنی کے ذریعے بام عروج تک پہنچایا، جہاں سے مختلف میدانوں کے ماہرین اور سپاہی تیار ہوئے، جو پوری دنیا میں مختلف شعبۂ حیات کی پیاس ماضی میں بجھائے ہیں اور آج بھی بجھا رہے ہیں۔ سرسید کو خراج عقیدت یہی ہے کہ ان کے ویژن ومشن کو آگے بڑھایا جائے، نامکمل کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے، ان کی تالیفات و تصنیفات کو یکجا کیا جائے، نیز تحقیقات کے نئے نئے دریچے کھولے جائیں تاکہ نئی پرتیں کھل سکیں، اردو کے ساتھ انگریزی تحریروں کو بھی یکجا کرنے ضرورت ہے، نئے رموز واوقاف اور بہتر گیٹ اپ کے ساتھ شائع کرنے کی اشد ضرورت ہے اور وقت کا تقاضا بھی۔ آج لمحۂ فکریہ ہے کہ کوئی اور سرسید کیوں نہیں؟ کب تک ہم ماضی کا رونا روتے رہیں، مسائل کا ڈھیر لگاتے رہیں، کسی خضر راہ کی راہیں تاکیں۔ بس امکانات تلاش کرنے کی ضرورت ہے، لائحہ عمل اور پالیسیاں بنانے کی ضرورت ہے۔ جب منصوبے اور اہداف ہوں گے تو اقدامات بھی کئے جائیں گے۔ ہم یہاں اقلیتوں میں اکثریت کا درجہ رکھتے ہیں اور عالمی پیمانے پر ہماری تعداد تو دوسری ہے، تاریخ شاہد ہے غزوہ بدر کا واقعہ، دریائے دجلہ، افریقہ کا جنگل، اسپین کی مسجد قرطبہ، بغداد ونیشاپور کے تعلیمی ادارے۔ حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم کو جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی جماعت میسر ہوئی تو سرسید احمد خاں علیہ الرحمہ کو مخلص رفقاء، نمونے سامنے ہیں، ہمیں بھی نمونہ پیش کرنے کی ضرورت ہے، بغیر ٹیم اور کپتانی کے بازی جیتنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

عالمی تناظر میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جو سرسید احمد خاں نے کر دکھایا، بے سروسامانی میں ایسی دانشگاہ کی بنیاد رکھی جس کی نظیر نہیں ملتی، تن من دھن سب کچھ قوم کے لئے جھونک دیا، وقت سے پہلے سر کے بال سفید ہوگئے۔ جوانی میں بوڑھے دکھنے لگے۔ سب کچھ لٹا کر جب ۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء میں اللہ کو پیارے ہوئے تو کفن تک کا پیسہ نہیں، ایک رفیق محسن الملک کی صدا بلند ہوتی ہے:

سرسید کو آخری چندہ دے دو

کیا ہندوستان کی تاریخ ایسی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے، افسوس صد افسوس، آج ہم محض شکوہ کناں، نوحہ خواں اور مرثیہ خوانی کے عادی رہ گئے، لیکن یہ سب کب تک؟ مسلکی برادری اور علاقائی تعصبات سے پڑے، سرسید احمد خاں علیہ الرحمہ کی طرح مجنوں ودیوانہ بننے کی ضرورت ہے اہداف ومقاصد طے کرنے کی حاجت ہے اور ان ہی کی پیروی کرتے ہوئے رفقاء تیار کرنے کی جہاں اشد ضرورت ہے، وہیں وقت کا تقاضا بھی، بس:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

☆

دی محمڈن نیشنل میگزین: سیال کوٹ میں علی گڑھ تحریک کا ترجمان

اسعد فیصل فاروقی

اردو میں علمی اور اصلاحی صحافت کا آغاز سرسید سے ہوتا ہے۔ سرسید کی صحافتی خدمات نے نہ صرف صوبہ مغربی و شمالی بلکہ پنجاب میں بھی بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے دوش بدوش یہ شمع دوسرے علاقوں کے مقامی رسائل میں بھی روشن رہی اور سرسید کے مشن کو بڑھانے اور قوت و رفتار دینے کا سبب بنتی رہی۔ ایسے ہی رسالوں میں سے ایک دی محمڈن نیشنل میگزین، سیالکوٹ ہے۔ سطور ذیل میں اس کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

'دی محمڈن نیشنل میگزین'، سیال کوٹ سے یکم اگست ۱۸۹۳ء کو جاری ہوا۔ علی گڑھ تحریک سے جڑے ہونے کے باوجود اس میگزین کے بارے میں لوگوں کو معلومات نہیں ہے۔ امداد صابری کے علاوہ دیگر محققین اور مورخین صحافت نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہیں امداد صابری کی اطلاع بھی ناکافی ہے اور انہوں نے صرف اس کا ذکر سرسری طور پر ایک دو جملوں میں تبلیغ، جبل پور کے حوالے سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ نہ انہوں نے اس کے ایڈیٹر اور نہ ہی پریس اور مہتمم کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ البتہ تبلیغ، جبل پور' کا 'دی محمڈن نیشنل میگزین' پر تبصرہ ضرور نقل کر دیا ہے، جو سطور ذیل میں درج ہے:

''محمڈن نیشنل میگزین یہ ضخیم پرچہ سرمور گزٹ کا نعم البدل سیال کوٹ سے شائع ہوتا ہے۔ تہذیب الاخلاق و سوشل حالات پر بسیط و طویل آرٹیکل لکھتا ہے، تاریخی واقعات کو دل چسپ بیان کرتا ہے۔ کاغذ و چھپائی کی عمدگی و صفائی میں اکثر دیسی اخبارات سے اس کا نمبر بڑھا ہوا ہے۔ یکم اگست سے جاری ہوا ہے۔'' (ص ۶۶۵، تاریخ صحافت اردو، حصہ سوم، امداد صابری، دہلی،۱۹۶۳ء)

تبلیغ، جبلپور کے اس تبصرہ نے بھی اس میگزین کے بارے میں زیادہ کچھ روشنی نہیں ڈالی لیکن اس کے ایک جملہ 'سرمور گزٹ کا نعم البدل' نے راقم کو یہ اشارہ دیا کہ یہ میگزین بھی سرمور گزٹ، ناہن کی طرح پنجاب میں علی گڑھ تحریک کی اشاعت و تشہیر کا ذریعہ رہا ہوگا۔ اور اس کے مدیر سرسید کے پنجاب کے کوئی ساتھی رہے ہوں گے۔ اس سلسلے میں راقم نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ حال ہی میں اس میگزین کے یکم اگست، ۲۰ راگست، یکم ستمبر، ۱۰ر ستمبر، ۲۰ رستمبر ۱۸۹۳ء کے شمارے ریختہ کی ویب سائٹ سے دستیاب ہوئے جس سے یہ عقدہ کھلا کہ پنجاب میں علی گڑھ تحریک کے سرگرم رکن اور معروف صحافی قاضی سراج الدین نے یکم اگست ۱۸۹۳ء کو یہ دس روزہ میگزین 'تہذیب الاخلاق'، علی گڑھ کی طرز پر سیال کوٹ سے جاری کیا تھا۔ یہ وہی قاضی سراج الدین ہیں جنہوں نے سرمور گزٹ، ناہن (۱۸۸۸ء) اور چودھویں صدی، راولپنڈی (۱۸۹۶ء) بھی جاری کئے۔ محمڈن نیشنل میگزین (۱۸۹۳ء) ان دونوں اخباروں کے درمیان کی ایک کڑی ہے۔ قاضی سراج الدین نے یہ میگزین پونچھ میں چیف جج مقرر ہونے سے قبل جاری کیا تھا۔

محمڈن نیشنل میگزین کے مذکورہ بالا پانچ شماروں کا جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ سرورق کا ڈیزائن 'تہذیب الاخلاق' جیسا ہے۔ سرورق پر نصف حصے میں سب سے اوپر میگزین کا ٹائٹل ہے۔ منقش بیل بوٹوں کے درمیان 'The Mohammadan' نصف گولائی میں پھر 'National Magazine' مستطیل خانے کے اندر جلی حروف میں درج ہوتا ہے۔ پھر اس کے ذیل میں '**محمڈن نیشنل میگزین**' اردو میں درج ہے۔ اس کے نیچے قوسین میں '**قومی محمڈن**' چھپا ہے۔ اس کے بعد اگلی سطر میں مقام اشاعت '**سیال کوٹ**' اور اس کے نیچے تاریخ اشاعت، جلد اور شمارہ نمبر درج ہے۔ نصف آخر سے مواد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میگزین کے آخری صفحہ پر درج معلومات کے مطابق اس کی اشاعت آب حیات پریس، سیال کوٹ میں باہتمام منشی کرم بخش ہوئی تھی۔ لیکن پہلے پرچہ میں مہتمم کا نام منشی کرم بخش کی جگہ قاضی محمد حسین درج ہے۔ پہلا شمارہ ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے لیکن دیگر چار شمارے ۲۴ صفحات کو محیط ہیں۔ تمام شماروں میں مضامین اور خبریں دو کالم میں درج ہیں۔ چندہ سالانہ عام خریداروں کے لیے دس روپیہ اور طالب علموں کے لیے پانچ روپیہ تھا۔ ہر پرچے میں چار پانچ مضامین شامل کیے جاتے تھے نیز چند رپورٹیں اور خبریں بھی درج ہوتی تھیں۔ رسالے میں کہیں بھی مدیر کا نام درج نہیں، البتہ پہلے شمارے کے اداریے میں یہ شواہد ملتے ہیں کہ یہ رسالہ منشی سراج الدین کی ادارت میں نکلا۔

محمڈن نیشنل میگزین، سیال کوٹ دراصل سرمور گزٹ ناہن کا تسلسل تھا۔ اس کا پہلے شمارے پر جلد ۶، نمبر ۱ درج ہے، یعنی 'سرمور گزٹ'، 'دی محمڈن نیشنل میگزین' میں تبدیل ہو گیا تھا اور اس نے مقام اشاعت بھی ناہن سے بدل کر سیال کوٹ اختیار کر لیا تھا، لیکن مدیر نے اس کو نئے جلد نمبر سے نہیں بلکہ سرمور گزٹ کے جلد نمبر سے جاری کیا۔ جس کا تذکرہ منشی سراج الدین نے اپنے اداریہ میں بھی کر دیا ہے۔ اپنے پہلے اداریہ میں وہ لکھتے ہیں:

''میرا قیام اور سکونت ایسی جگہ تھی جہاں میں اپنی خواہش کے مطابق ایک قومی اخبار کا حسب دلخواہ انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اب خدا کی مہربانی سے وہ وقت بہت قریب آ گیا ہے کہ میں اپنے موجودہ اخبار سرمور گزٹ کے نام، مقام اور حالت کو تبدیل کر کے ایسا بنا سکوں جیسی کہ ایک قومی اخبار کے بنانے کی میری دلی خواہش ہے۔''۲۶

۲۴ صفحات پر مشتمل یہ دس روزہ اخبار نما رسالہ مکمل طور پر علی گڑھ تحریک کی سرگرمیوں سے رنگا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی اخلاقی، تعلیمی، سیاسی، اور سماجی مسائل سے متعلق خبریں درج ہوتیں نیز علی گڑھ تحریک سے جڑی ہوئی شخصیات اور طلبائے ایم او کالج کی تحریریں پیش کی جاتیں۔ لکھنے والوں میں مولانا شبلی، حاجی محمد اسمٰعیل خاں، غلام الثقلین، سید رضا، منشی سراج الدین (والد ظفر علی خاں)، محمد نصیر وغیرہ شامل تھے۔

یکم اگست ۱۸۹۳ء (جلد ۶، شمارہ ۱):

پہلا شمارہ بابت یکم اگست ۱۸۹۳ء میں صفحہ ۲ پر علی گڑھ تحریک اور مسلمانوں سے متعلق سرگرمیوں کو درج کیا گیا ہے مولانا مولوی نذیر احمد کے بارے میں محرم علی چشتی نے جو غلط بیانی کی تھی اس تعلق سے معافی نامہ محرم علی چشتی کی جانب سے درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بارے میں بھی اطلاع فراہم کی گئی ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد نیز جاپان میں اسلام کے فروغ کے بارے میں مختصر نوٹ دئے گئے ہیں۔ اداریہ چار صفحے پر مشتمل ہے۔ جس میں مدیر قاضی سراج الدین سب سے پہلے سرسید کے کاموں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اس جواں ہمت شخص کو کوئی چیز ڈرانے والی اور اپنے اس پر خطر ارادہ سے باز رکھنے والی نہ تھی۔ دور سمندروں کے پار پہونچ

کر اس روشنی کی کیفیت اور جس طرح سے وہ حاصل کی گئی تھی اور پیدا کی گئی تھی اس کی تدبیروں اور طریقوں پر غور کیا اور جو کچھ اس روشنی میں سے وہ اپنے ساتھ لا سکتا تھا لا کر اپنے ملک کو واپس پہنچا۔اس روشنی سے وہ کیونکر کام لے گا اس کا وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ سونے والوں کو اب اس نے روشنی دکھا کر جگانا شروع کیا۔اس نظر خیرہ کرنے والی روشنی کو دیکھ کر وہ نشہ غفلت کے متوالے اور بھی گھبرائے، چونک چونک کر اٹھے۔ بگڑتے ہیں ناراض ہوتے ہیں، غصہ ہوتے ہیں جھنجھلا کر کہتے ہیں تم کون ہو۔ ہمارے آرام میں کیوں مخل ہوتے ہو، خواب استراحت سے ہمیں کیوں جگاتے ہو، چلو یہاں سے ہٹو، ہمیں سونے دو، مگر وہ جگانے والا اس سے باز نہیں آتا۔ پیار کرتا ہے، دلاسا دیتا ہے، ڈراتا ہے، دھمکاتا ہے، ان کی خطرناک حالات اور مصائب پر پہونچ جانے سے آگاہ کرتا۔ان کو روشنی دکھا کر کہتا ہے دیکھو تمھاری تباہی کی نوبت کہاں تک پہنچ گئی۔''

اپنے اسی اداریے میں تہذیب الاخلاق کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج اس وقت جبکہ ہم مسلمانوں کے واسطے ایک قومی اخبار کا بار گراں جس کے اٹھانے کے ہم لائق نہیں ہیں اپنے سر پر اٹھانے لگے ہیں اور ایک ایسا مشکل اور ذمہ داری کا کام اختیار کرنے لگے ہیں ہمارا مقصد ایک پاک اور بزرگ کام کی طرف اشارہ کرنے سے تھا جو مسلمانوں کی قومی مضمون نویسی کا صرف دیباچہ اور ابتدا ہی نہ تھا بلکہ خاتمہ اور انتہا بھی وہی تھا۔''

اس میگزین نے علی گڑھ تحریک کے دیگر مشاہرین کے تذکروں کو پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لئے پہلے ہی شمارے میں مدیر نے ایک عرض داشت مع نوٹ بعنون ''ہمارا پہلا نیا کام کیا۔اس زمانہ کے مشاہیر قوم کے تذکروں کا لکھا جانا'' شائع کی۔اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''جن متعدد نئے کاموں کے کرنے کا ہم نے ارادہ کیا ہے ان میں سے سب سے پہلے جس ایک کام کو ہم اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ اس زمانے کے مشاہیر قوم کو لکھا جانا ہے اور اخبار کے ذریعہ شائع کرنا ہے۔ ہم نے اپنے پہلے مضمون میں اس بات کو بیان کیا ہے کہ اپنی قوم کی گذشتہ تاریخ سے ہم اپنی قوم کے نامور بزرگوں کے تذکرے لکھنے اور چھاپنے کو ایک نہایت مفید کام سمجھ کر اپنا ایک خاص مقصد بنانا چاہتے ہیں اور اختیار کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم بوجوہ اس کام کو سب سے ضروری اور مقدم سمجھتے ہیں کہ اپنی قوم کے اس زمانہ کے بزرگوں اور مشاہیر کے حالات اور تذکرے لکھ کر اخبار میں چھاپے جاویں اور ایک نہایت فائدہ اور ضرورت کے کام کو انجام دیا جاوے۔''

قاضی سراج الدین نے اس تعلق سے محسن الملک، مولوی چراغ علی، سردار محمد حیات خاں، سید محمود، سید امیر علی، خلیفہ سید محمد حسن، مولوی سید علی بلگرامی، نواب عماد الملک، خواجہ الطاف حسین حالی، منشی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی شبلی نعمانی، راجہ جہاں داد خاں اور خان بہادر برکت علی خاں پر مشتمل چودہ مشاہرین کی ایک فہرست بھی درج کی جن کی زندگی کے بارے میں وہ اپنے اخبار میں لکھنا چاہتے تھے: وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اس وقت تک جن مشاہیر قوم کے نام ان کے تذکرے لکھے جانے کے واسطے منتخب کئے ہیں وہ ذیل میں عرض کرتا ہوں۔ لیکن ان کے لکھنے سے پہلے میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سید قوم جناب قبلہ و کعبہ آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر بالقابہ کا نام جو ایسے ناموں کی فہرست میں سب سے پہلا نام ہونا چاہئے تھا اس فہرست میں نہ دیکھ کر آپ حیران نہ ہوں کیونکہ حضرت ممدوح کے پورے حالات جیسے کہ میں لکھ سکا ہوں ایک کامل بیاگرافی کی صورت میں لکھ چکا ہوں اور وہ کتاب حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاؤلی کے

پاس چھپنے کے واسطے رکھی ہوئی ہے اور امید ہے کہ وہ اس کو جتنی جلدی ممکن ہوگا چھاپ کر شائع کر دیں گے۔''

قاضی سراج الدین اس رسالہ کے ذریعے سرسید اور ان کے ساتھیوں کے مخالفین کو مدلل جواب دینا چاہتے تھے اور علی گڑھ تحریک کی جڑوں کو پنجاب کے قریہ قریہ میں مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ اس تعلق سے وہ تہذیب الاخلاق کے مضامین کو دوبارہ چھاپنے کی بھی خواہش رکھتے تھے۔ جب محرم علی چشتی نے اپنے اخبار رفیق ہند میں حافظ نذیر احمد اور سرسید پر جھوٹے الزامات لگائے تو منشی سراج الدین نے اپنے اس اخبار کے پہلے ہی شمارے میں مولوی فخر الدین نقوی فخری کا ایک مضمون 'لعنۃ اللہ علی الکاذبین' شامل کیا۔ جس میں مصنف نے نذیر احمد اور سرسید پر لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے اخبار رفیق ہند میں شائع خط کا جواب دیا ہے۔ اس پرچے کے آخری صفحات پر اشتہارات کے کالم میں کلکتہ کے اردو، بنگلہ اور انگریزی کے ایک اخبار 'حافظ' کا اشتہار درج ہے۔

۲۰ر اگست ۱۸۹۳ء (جلد ۶، شمارہ ۲):

اس پرچہ میں پہلا مضمون مدیر کے قلم سے بعنوان 'نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں بہادر' درج ہے۔ جس میں مدیر نے حیدر آباد میں ان کی انتظامی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ ایک دوسرا مضمون مرزا غلام محمد قادیانی پر ہے، جس کو شیخ سراج الدین احمد (پوسٹ ماسٹر جنرل ریاست کشمیر) نے تحریر کیا ہے۔ دراصل یہ مضمون مرزا غلام محمد قادیانی کی سرسید پر اس تنقید کا جواب ہے جو انہوں نے سرسید کے خلاف لکھا تھا۔ شیخ سراج الدین لکھتے ہیں:

''میں نے حضور کا مضمون بعنوان سید احمد خاں صاحب سی ایس آئی پر ایک ضروری اتمام حجت جو حضور نے اپنی کتاب الموسوم بہ آئینہ کمالات اسلام میں صفحہ ۲۲۶ سے صفحہ ۲۷۳ پر ختم کیا ہے۔ مکرر سہ کرر پڑھا اگرچہ اس تحریر کے مخاطب و مشارٌ الیہ سرسید ہیں اور اس لئے اس کے جواب دینے یا نہ دینے کے بھی وہی مختار ہیں مگر چونکہ خاتمہ پر حضور نے جملہ فریفتگان حضور ممدوح الشان کو مخاطب کر کے نصیحت اور دعوت حق کی ہے اور چونکہ میں بھی اس ہمدرد اسلام و ہمدرد مسلمانان واجب التعظیم سید کے فریفتوں اور فدایوں کا ادنیٰ اور ناچیز خادم ہوں جس کو سوائے اپنی قوم کے تمام دنیا کی قومیں ایسا ہی خیال کرتی ہیں لہٰذا میرا عریضہ بیجا اور بے محل نہ متصور ہوگا۔''

اس کے بعد ایک مضمون بعنوان **'اصول تاریخ'** درج ہے جو کہ مولوی سید کرامت حسین، پروفیسر قانون، علی گڑھ نے اسپنسر کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا۔ اس مضمون کو انہوں نے اخوان الصفا میں پڑھا تھا۔ اس پرچے میں حاجی ریاض الدین احمد کا ایک مراسلہ **'حجاج ہند کی مصیبت'** کے عنوان سے درج ہے۔ جس میں مراسلہ نگار نے ہندوستانی حاجیوں کی ان پریشانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میگزین کے آخر میں **'مکہ معظمہ'** کے عنوان سے ایک مختصر مضمون میں وہاں کے حالات کا ذکر ہے۔

یکم ستمبر ۱۸۹۳ء (جلد ۶، شمارہ ۳):

میگزین کے اس پرچے میں مولوی شبلی نعمانی کا مضمون **'اسلامی کتب خانے'** شامل اشاعت ہے۔ اس مضمون میں مولوی شبلی نعمانی نے اسلامی کتب خانوں کی اجمالی تاریخ بیان کی ہے اور مختلف ادوار میں اسلامی حکومتوں میں کتب خانوں کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ شبلی اس مضمون کی تمہید میں لکھتے ہیں:

''اسلامی کتب خانوں کی یہ ایک نہایت اجمالی تاریخ ہے۔ اگرچہ اس امر سے کسی شخص کو انکار نہیں ہوسکتا کہ تصنیف و تالیف اور علمی ذخیروں کا مرتب و محفوظ رکھنا مسلمانوں کا قومی شعار تھا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں کثرت سے جا بجا کتب خانے اور دار العلم پائے جاتے تھے شاید دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی تاہم بہت تعجب ہے کہ کتب خانوں کے حالات

میں آج تک کوئی کتاب بلکہ مضمون تک نہیں لکھا گیا۔ جغرافیہ کی کتابوں میں کسی شہر کا حال لکھتے ہیں تو ہر قسم کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن کتب خانوں کا نام تک نہیں آتا۔ یہی خیال ہے جس نے مجھکو اس مضمون کے لکھنے پر آمادہ کیا۔"

اس شمارے کا دوسرا مضمون بعنوان 'مذاق' عبدالحق (طالب علم محمڈن کالج، علی گڑھ) کا تحریر کردہ ہے۔ جس میں مضمون نگار نے لفظ مذاق کی تعریف کے ساتھ اس کے صحیح استعمال اور اس کے عیب پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون میں اس کے اصلاحی پہلو پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک اور عام نقص مذاق میں پایا جاتا ہے جسے میں عیب نہیں سمجھتا بلکہ بڑا گناہ سمجھتا ہوں اور وہ مذہبی حملہ ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس کی پروا کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہ اسے برا نہیں سمجھتے۔ ہم نے مانا کہ ان ہی کا مذہب سچا سہی مگر اس کے کیا معنی کہ دوسرے مذہب کو برا بھلا کہا جائے۔ جب وہی الفاظ ان کے مذہب کی نسبت کہے جاتے ہیں تو انہیں کس قدر برا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ کتنی بڑی خودغرضی اور ناانصافی ہے کہ وہ اوروں کو جو چاہیں کہہ لیں۔ مگر انہیں کوئی کچھ نہ کہے۔ افسوس جنہیں اپنا اس قدر خیال ہے وہ دوسروں کی طبیعت کا ذرا بھی اندازہ نہ کرسکیں۔ اس بات کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے کہ دوسرے مذہب کو برا کہنے سے اپنا مذہب کبھی سچا نہیں ہوتا۔"

بعدازاں ایک رپورٹ حاجی محمد اسمٰعیل خان کی طلباء مدرسۃ العلوم کے لئے ٹی پارٹی مع خطاب حاجی محمد اسمٰعیل خاں درج ہے اور اس موقع پر خوشی محمد ناظر نے کچھ اشعار جو ان کی نذر کئے تھے وہ بھی درج ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے ہمارے مفتخر اور متکا　　اے ہماری قوم کے حاجت روا
اے ہمارے زائر بیت الحرم　　دین و دنیا میں ہمارے رہنما
آپ کا ہے ہم پہ وہ لطف کرم　　شکر جس کا ہو نہیں سکتا ادا
پر نہیں یاں حاجت شکرانہ کچھ　　یہ نہیں مہر پدر کا مقتضا
طفل ناداں در سر باز بچہ ماند　　ہست بر جان پدر آزار ما
جانتے ہیں ہم کہ یہ ٹی پارٹی　　ہے تیری چاہت کا ادنیٰ ولولا
کالج اسلام کے دیوار و در　　ہیں تیری قومی حمیت کے گواہ
مال و دولت علم و دانش آپ کا　　وقف تعلیم مسلمانان رہا
جیب میں تھا ان کے سرسید کا ہاتھ　　جی میں آیا جس قدر کھسکا لیا
ہو فلاح قوم کی کوئی خبر　　آپ کو پاتے ہیں اس کا مبتدا
حاجی اسمٰعیل خاں کا آستاں　　ہے خلیل اللہ کا مہماں سرا
ان پہ منتر ہند کا چلتا نہیں　　ہر برس کھاتے ہیں مکہ کی ہوا

'اسلام کا آغاز اور اس میں موجودہ مخالفت' جس کے مضمون نگار محمد اسلام ساکن آگرہ ہیں یہ پرچہ کا آخری مضمون ہے۔ اس میں مضمون نگار نے اسلامی تاریخ کے روشن واقعات کا احاطہ کرتے ہوئے، موجودہ دور کے مسلمانوں کی حرکات وسکنات کا تجزیہ کیا ہے اور نومسلم عبداللہ کولیم اور شیخ محمد الگزنڈر ویب کے تعلق سے مسلمانوں کے ایک گروہ میں جو مخالفت پائی جاتی تھی اس پر تنقید کی ہے۔ آخر میں **'مختلف واقعات'** کے کالم کے تحت عالم اسلام میں ہونے والے مختلف واقعات پر سرسری روشنی ڈالی گئی تھی۔

۱۰ ستمبر ۱۸۹۳ء (جلد ۶، شمارہ ۴):

۱۰ ستمبر ۱۸۹۳ء (نمبر ۴، جلد ۶) کے پرچے میں سب سے پہلے **تاج محل** پر ایک مفصل مضمون شامل ہے جس میں اس خوبصورت عمارت کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مضمون ناردن انڈیا میگزین سے نقل کیا ہے۔ مضمون نگار اپنی تمہید میں رقمطراز ہے:

"تاریخ عالم ہم کو ایک عجیب منظر دکھلاتی ہے اگر مختلف اقوام وممالک کے سلسلہ وار تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک گذشتہ قوم کی عزت وشان مٹانے

کے لئے دوسری قوم جو فی الوقت کامیاب ہوتی ہے کس قدر کوشش کرتی ہے اور اس کے جملہ خصایل حمیدہ پر حملہ ہوتا ہے اور کل اوصاف سیاست و نظامت عیب بینی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ آثار وشواہد رفتگاں کی پامالی گورنمنٹ وقتیہ کے ضروری فرائض سمجھے جاتے ہیں یہ کیفیت عام اقوام کی ہے مگر شاید مسلمانوں کا معاملہ اس سے بھی زیادہ عبرت انگیز اور حسرت آمیز ہے ان کی شان وشوکت مردہ کتابوں میں اور افلاس ونکبت زندہ نگہوں میں جلوہ گر ہے۔ موجودہ فلاکت کے دیکھتے ہوئے کامیاب قوم کا کانشنس اجازت نہیں دیتا کہ وہ پامال قوم کی گذشتہ شوکت کا اقرار کرے۔ وہ نہیں سمجھتی بلکہ نہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے کہ کسی طرح موجودہ مفلوک الحال جو آج کمال بے ہنری سے آراستہ ہے وہ کبھی زکی الطبع اور مختلف علوم وفنون سے مالامال رہی ہے۔''

شاہجہاں کے مذاق تعمیرات اور تاج محل کی خوبصورتی کا اظہار کرتے ہوئے مصنف رقمطراز ہے:

''جس طرح خلفائے بنی امیہ میں خلیفہ ولید فن تعمیرات میں ایک خاص مذاق رکھتا تھا اور جس کے ایجاد پسند طبیعت نے اس شاخ خاص میں وہ وہ جدتیں پیدا کیں کہ بالآخر ایک طرز خاص محمڈن اسٹائل تعمیرات میں مشہور ہوگیا۔ اور اسی طرح ہندوستان کا ولید اس فن کے لحاظ سے خلد آشیاں شاہجہاں تھا جس کی لطافت طبع اور موزونی مذاق نے منجملہ اور نادر عمارات کے تاج محل سی بشکل عمارت بنائی جن کی نظر آج تک چشم فلک نے نہ دیکھی اور دنیا کے سیاحین اور اعلیٰ درجہ کے مبصرین کے زبان سے اعتراف کرادیا۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب''

اس شمارہ کی دوسری تحریر 'کشمیر کی مساجد شاہی کی مرمت' کے عنوان سے ہے۔ جس کے تحت سردار محمد حیات خاں کی اسپیچ کو پیش کیا گیا ہے جو انہوں نے ۲۵راگست ۱۸۹۳ء کو جمعہ کی نماز کے بعد وہاں کی مسجد میں کشمیر کے مسلمانوں کے سامنے دی اور کشمیری مسلمانوں کو آپس میں اتحاد قائم کرنے، اپنی قوت کو تعلیم کے فروغ میں صرف کرنے کی نصیحت کی۔ نیز کشمیر کی شاہی مساجد کی مرمت کے لئے چندہ دینے کی بھی گذارش کی تھی۔ اس تقریر کے اقتباس جس میں انہوں نے دینوی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی سطور ذیل میں پیش ہے:

''مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ میرے خیال میں سب سے بالاتر ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں مجھ کو اس امر کی نہایت فکر رہی ہے اور اس خیال میں سرگرداں رہا ہوں کہ مسلمانوں میں علوم دینوی کی ترقی کیونکر ہوسکتی ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم انتہا درجہ کی پستی کی حالت میں ہے۔ مسلمانوں کی آبادی یہاں پچانوے فیصدی کی ہے مگر تعلیم پانچ فیصدی بھی نہیں۔ اس سے زیادہ افسوسناک امر کیا ہوسکتا ہے مسلمانوں کی تعلیم دینوی ترقی کے ساتھ لازم وملزوم ہے اگر تعلیم نہ پائیں گے تو دنیا میں عزت و امتیاز حاصل نہ کرسکیں گے اور شوکت اسلام کے واسطے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے امور مملکت میں دخل حاصل ہو اور حصہ پائیں۔''

اس کے بعد 'خاندان نبوت' کے عنوان سے ایک مضمون ملتا ہے۔ یہ مضمون رسالہ دلگداز، لکھنؤ سے نقل کیا گیا ہے۔ مضمون میں انگلستان کے معروف مورخ گبن کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان سے متعلق خیالات پر تنقیدی نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے متعصب رویہ کو بیان کرتے ہوئے اس کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے۔ ایک مختصر مضمون بعنوان **'فخر الدولہ ابن المعتمد علی اللہ'** بھی درج ہے، جس میں قرطبہ کے اس شہزادے کے حالات پیش کئے گئے ہیں جس نے یوسف بن تاشقین کے حملے کے بعد غربت کی زندگی گزاری۔ مضمون میں شہزادے کی حالت غیر پر ابوبکر دانی کے کچھ اشعار اور ان کا ترجمہ بھی درج ہے۔ اسی پرچہ میں سید رضا علی، طالب علم مدرسۃ

العلوم کا خط شامل ہے جس میں انہوں نے سرکاری ملازمت ملنے کے بعد اپنی تنخواہ سے سو روپے کالج کو پیش کئے۔

رسالہ میں ایک اخلاقی مضمون 'فحش الفاظ اور ہندوستانیوں کی گفتگو' شامل ہے، جس میں فحش گفتگو کے نقصانات درج کئے گئے ہیں۔ 'سلطنت روم عیسائیوں سے کیسے پیش آتی ہے' کے عنوان سے ایک مختصر تحریر میں سلطنت روم میں رہنے والے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کا کیا برتاؤ تھا اس پر گفتگو کی گئی ہے۔ شمارے کا آخری مضمون 'التعلیم والتعلم' ہے، یہ ایک قسط وار مضمون ہے، جس میں مضمون نگار کا نام درج نہیں ہے۔ اس مضمون میں تعلیم اور تعلیم یافتہ ہونے کی تعریف اور اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ رسالہ میں درج ہے:

''تعلیم سے جو کچھ مقصود ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو اپنے فرائض منصبی سے واقفیت اور ان کو پورا کرنے کا شوق ہو۔ اس کے قول وفعل اسکے خیالات میں ایک خاص درجہ کی خصوصیت اور صداقت پیدا ہو اور یہی وہ صفات ہیں جو لفظ تعلیم یافتہ سے تعبیر کئے جانے کے مستحق ہیں اور تمام ان مقاصد کا لب لباب ہیں جن کے حصول کے لئے تعلیم قایم کی گئی ہے۔''

۲۰ رستمبر ۱۸۹۳ء (جلد ۶، شمارہ ۵):

۲۰ رستمبر ۱۸۹۳ء (نمبر ۵، جلد ۶) کی میگزین میں پہلا مضمون بعنوان 'کم عمری میں شاعری' غلام الثقلین کا لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے شاعری کی تعریف کے ساتھ اس کے اصول وفروغ پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ مضمون نگار لکھتا ہے:

''جب تک ملک کے عام مذاق میں ترقی نہ ہو اور پڑھنے والوں کا بڑا گروہ شعر اور نظم میں تمیز نہ کر سکے اس وقت تک اصل شاعری کے بخوبی رواج پانے کی بہت ہی کم امید ہے۔ جو لوگ شاعر بنا چاہتے ہیں (اور اس سے زیادہ مشکل شاید ہی کوئی کام دنیا میں ہو) یا شعر کی تنقید کرنی چاہتے ہیں ان کو ضرور ہے کہ انگریزی کے اس مشہور مقولہ کو بخوبی ذہن نشین کر لیں ''شاعر پیدا ہوتے ہیں، بنتے نہیں''۔ اسی کے قریب کا وہ مقولہ ہے جو مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے۔ ''الشعراء تلامیذ الرحمن'۔ یعنی شاعر خدا کے شاگرد ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے شعر کو نہیں سیکھ سکتے۔ ہماری زبان میں جو کچھ شاعری کی ترقی ہوئی ہے وہ زیادہ تر فارسی کا نتیجہ ہے اور متاخرین نے فارسی میں جو کچھ اصول اور طریقے اور قاعدے نظم کے مقرر ہوئے ہیں، بہت تھوڑے تغیر وتبدل کے ساتھ وہی طریقے اردو میں بھی جاری ہو گئے ہیں اور اس وقت ہمارے شاعروں کا جم غفیر انہیں قواعد کی پابندی کرتا ہے۔''

اس پرچہ کا دوسرا مضمون 'تعلیم وتعلم' کی دوسری قسط ہے، جس میں اسلام کی نظر میں تعلیم کی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے نیز علم الادیان پر رائے دی گئی ہے۔ محمد نصیر طالب علم مدرسۃ العلوم نے 'انسان کا مقدر' کے عنوان سے مضمون پیش کیا ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں انسان کو ضعیفی میں کس طرح اپنی زندگی بسر کرنا چاہئے کے موضوع پر مختلف فلسفیوں کے حوالوں سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ آخر میں ایک تحریر 'آنریبل جسٹس سید محمود' کے عنوان سے شامل ہے۔ جس میں ان کا مختصر تعارف اور خدمات کو درج کیا گیا ہے۔

ان پانچ شماروں کے مواد کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قاضی سراج الدین کا یہ میگزین پنجاب میں علی گڑھ تحریک کا علم بردار تھا اس کے ذریعہ انہوں نے سر سید اور علی گڑھ کے پیغامات کی تشہیر وتبلیغ کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس میگزین نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے احساس کو بیدار کرنے کے لئے نہ صرف تاریخی مضامین کی اشاعت کی بلکہ ان کی اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے بھی تحریریں چھاپیں۔ اسی کے ساتھ یہ میگزین مسلمانوں کے قومی اور سیاسی مسائل میں بھی دلچسپی لیتا تھا اور اس تعلق سے بھی اس نے واقعات اور خبروں کو جگہ دی۔

ماضی کے دریچے سے

حیاتِ سرسید کے ابتدائی اوراق

اصغرعباس

پرانی دلّی جسے شاہ جہاں آباد بھی کہتے تھے،صدیوں دانش و تہذیب کا مرکز رہی ہے۔ یہاں انیسویں صدی میں ایک مشہور محلّہ فیض بازار تھا۔وہاں اوراس کے آس پاس مشرقی علوم کے مستند علمارہتے تھے۔یہیں فارسی اوراردو کے مشہور شاعر شیفتہ اورصدر الدین آزردہ کے مکانات تھےاورانھیں مکانات کے قریب حکیم مومن خاں کی گلی تھی اور یہیں سرسید کے دوست امام بخش صہبائی اورمولوی ذکاءاللہ رہتے تھے۔درویشوں کے درویش شاہ غلام علی مجددی کی خانقاہ اور مدرسہ بھی یہاں تھا۔اس خانقاہ میں ہندوستان ہی کے نہیں افغانستان اورترکستان سے آئی ہوئی خلقت کا ہجوم رہتا تھا۔فیض بازار کے بیچوں بیچ سے چاندنی چوک کی طرح ایک مصفا نہر بہتی تھی جسے فیض نہر کہتے تھے۔اکتوبر کے مہینے میں اس نہر پر ان موسمی پرندوں کا ہجوم ہوتا تھا جودور دور کے ملکوں سے موسم سرما گذارنے دلی کے آبی علاقوں میں آجاتے تھے۔اسی فیض نہر کے داہنی طرف سے ایک راستہ نواب بیرم خاں کے تراہے کی طرف مڑتا تھا۔وہاں ایک حویلی تھی،حویلی کیا تھی اچھا خاصا قلعہ تھا۔اس میں باغ کے ساتھ فوارے،حوض اور چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں۔ خوشنما محرابوں کے دوہرے تہرے چوڑے دالان تھے۔ بہت سارے یک درے اور کمرے تھے اور راہداریاں کشادہ تھیں۔ منقش چھتیں، روشن کتب خانہ، جگمگاتے دیوان خانے اور حرم سرائیں تھیں۔ رنگین شیشوں کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ صدر دروازے کی رفعت وشان تو دیدنی تھی۔ یہ حویلی مغل بادشاہ کے وزیراعظم دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد مصلح جنگ کی حویلی کہلاتی تھی۔اسی حویلی کے شبستان اقبال میں آج سے تقریباً دوسو برس پہلے ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کوایک تومند بچہ پیدا ہوا جس کی پیشانی اونچی اور چمکتی تھی۔ سینہ کشادہ اور شانے چوڑے تھے۔سر بڑا تھا۔خوب موٹے موٹے ہاتھ تھے،موہنے والی آنکھیں تھیں، عقابی ناک تھی، ریشم جیسے بال تھے اور صبح صادق جیسی رنگت تھی۔ اس بچہ کے اَنگ اَنگ سے قوت اور توانائی ٹپکتی تھی۔ یہ بچہ سید محمد متقی اور عزیز النساء بیگم کی تیسری اولاد اور خواجہ فریدالدین احمد کا نواسہ احمد تھا۔ بعد میں جب اس کے کارناموں کی شہرت گاؤں گاؤں اور شہر شہر پہنچی تو یہی بچہ سرسید کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔احمد اپنے بڑے بھائی سید محمد اور بہن صفیۃ النساء بیگم کی پیدائش کے کافی دنوں بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی پیدائش پر حویلی میں خوب خوب خوشیاں منائی گئی تھیں۔ گیت گائے گئے تھےاور ہفتوں رت جگا رہا تھا۔

دلی کے دو روحانی مرکزوں کے سربراہوں سے احمد کے گھرانے کے خصوصی روابط تھے۔ان میں احمد کے والد تو شاہ غلام علی مجددی کے حلقۂ خاص میں شامل تھے اور مرید نے اپنے پیر کے دل میں اتنا گھر کرلیا تھا کہ شاہ صاحب جو اپنی خانقاہ سے کہیں شہر میں آتے جاتے نہ تھے۔ وہ سید متقی کے گھر کبھی کبھار آجاتے تھے اور یہ رشتۂ الفت اتنا مضبوط تھا کہ شاہ صاحب ان کے بچوں کی دکھ بیماری سے بھی بے چین ہوجاتے تھے۔ سید متقی نے اپنے

پیر طریقت سے نومولود کے نام کے لیے درخواست کی۔ شاہ صاحب نے بچے کا نام احمد رکھا۔ اس سے پہلے وہ احمد کے بڑے بھائی کا نام محمد رکھ چکے تھے۔

جب احمد ساڑھے چار سال کے ہوئے تو فروری کی ایک خوشگوار سہ پہر کو مسلمان شرفا اور امرا کے دستور کے مطابق احمد کی بسم اللہ کی تقریب ہوئی۔ اس روز حویلی میں شہر کے سارے معززین اپنی شاندار سواریوں پر آئے تھے۔ دہلی کے اہل اللہ بھی موجود تھے اور احمد کے سارے اعزہ جمع تھے۔ خوب مزے مزے کے کھانے پکے تھے۔ تقریب کے لیے سات قسم کی مٹھائیاں تیار کرائی گئی تھیں۔ حویلی قندیلوں کی روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اس روز احمد کو نہایت قیمتی پوشاک میں محفل میں لایا گیا تھا۔ وہ مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ جب ان کے سامنے چاندی کی تختی رکھی گئی جس پر اقرا کی اوّل کی آیتیں لکھی ہوئی تھیں اور شاہ غلام علی مجددی نے ان سے کہا تھا کہ پڑھ بسم اللہ الرحمن الرحیم تو احمد سے کچھ بولا نہ گیا تھا۔ وہ مبہوت ہو کر شرکائے محفل کو دیکھتے رہے لیکن جب شاہ صاحب نے انھیں اپنی گود میں بٹھالیا اور جیسے جیسے شاہ صاحب اقرأ کی اوّل کی آیتیں پڑھتے گئے، احمد بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتے گئے اور حاضرین محفل کی مبارک، سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مٹھائیوں کے سات خوان آئے، شیرینی تقسیم ہوئی۔ احمد کو رنگ برنگ کے تحفے اور اشرفیاں ملیں۔ ان سب باتوں میں احمد کو بہت مزہ آیا۔ اتنا مزہ کہ یہ تقریب انھیں عمر کے آخری حصے میں بھی یاد رہی اور خدا جانے یہ شاہ غلام علی صاحب کے قرآن پڑھانے کی برکت تھی یا احمد کی والدہ کا فیض تھا کہ انھیں خدا کی وحدت پر ایمان کامل میسر ہوا اور رسول اللہ کی ذات پاک سے مجذوبانہ حد تک عشق پیدا ہو گیا اور پھر جیتے جی سر سید کے جی سے رسول اللہ اور قرآن کی محبت نہ گئی اور جیسے جیسے احمد بڑے ہوتے گئے ان کے دل کے راستے قرآن پاک اور رسول اکرم کی محبت، ان کے شعور کا حصہ بنتی گئی اور بعد میں انھوں نے سیرت پاک پر کتابیں لکھیں اور قرآن مجید کی تفسیر بھی۔

احمد کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی، زندگی بھر جس شخصیت کا ان پر سب سے زیادہ اثر رہا وہ ان کی ماں تھیں۔ یہی ماں کی محبت تھی جس میں حب وطن بھی پوشید ہے اور حب قوم بھی اور اسی سے احمد میں تمام تمدنی نیکیاں اور خوبیاں پیدا ہوئیں جس کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ احمد کی والدہ کئی اعتبار سے اپنے زمانے کی خواتین سے آگے تھیں۔ انھیں بچوں کی تربیت میں حاصل تھا۔ وہ دلی کی اشرافیہ کی رکن رکین تھیں اس کے باوجود ان کا دل زر و زیور سے اتنا خوش نہ ہوتا تھا جتنا ضرورت مندوں کی حاجت روائی سے ہوتا تھا۔ وہ بیواؤں کی مونس و غم خوار تھیں اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کے لیے امید کا پیغام تھیں۔ وہ گھر کی آمدنی کا پانچ فیصد حصہ غریب عورتوں کی بیٹیوں کی شادی بیاہ اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ اپنی وسیع و عریض اور بیکس عورتوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ وہ انکی ہر طرح خبر گیری کرتی تھیں۔ انھیں لاوارث عورتوں میں ایک عورت زبین بھی تھی وہ بیمار پڑی۔ اتفاق سے احمد کی والدہ کو بھی وہی بیماری لاحق ہوئی۔ احمد بڑے ہو چکے تھے، کماتے تھے، اپنی والدہ کے لیے قیمتی معجون لے کر آئے جسے خاموشی سے ان کی والدہ نے زبین کو کھلا دیا۔ انیسویں صدی میں دنوں اور تاریخوں کی سعادت اور نحوست کا بہت خیال رکھا جاتا تھا لیکن احمد کی والدہ کو ان باتوں پر مطلق اعتقاد نہ تھا۔ وہ روایت شکن خاتون تھیں اور اسلامی اخلاق کا نمونہ تھیں۔ خدا ترسی کے کاموں کے لیے برادری بھر میں مشہور تھیں۔ انھوں نے قرآن پاک کے علاوہ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ اکثر جب ننھے احمد رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق سنانے جاتے تو سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی بچہ کی تنبیہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیتیں اگرچہ وہ احمد پر خفا تو کئی بار

ہوئیں لیکن ان سوت کی لڑوں سے ان پر کبھی مار نہیں پڑی۔ در اصل یہی ذات احمد کے لیے علم وہدایت اور تالیف قلب کا مصدر تھی۔ عزیز النساء بیگم ان عورتوں میں ہیں جن پر ہندوستان ہی نہیں، انسانیت سدا فخر کرتی رہے گی۔

بچپن میں احمد درسی کتابیں پڑھنے میں ذرا کم دل لگاتے تھے۔ اس کے باوجود انھیں پڑھائی پر اچھا خاصا وقت دینا پڑتا تھا۔ انھیں استاد سے پڑھا ہوا سبق والدہ کے علاوہ نانا کو بھی سنانا ہوتا تھا۔ نانا احمد کو سبق سنانے پر مزیدار مٹھائی دیتے تھے۔ ورنہ ڈانٹ پڑتی تھی۔ احمد ایک رات غمزدہ دل سے سبق سنا رہے تھے۔ ایک مصرعہ ''طمع راسہ حرفست ہر سہ تہی'' کا انھوں نے ترجمہ کیا کہ طمع کے تین حرف، تینوں خالی، نانا نے نظر اٹھا کر دیکھا، دوسری اور تیسری بار بھی جب احمد نے یہی معنی کہے تو نانا نے برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ بے پیرا سبق یاد نہیں کرتا اتنا کہنا تھا کہ نانا کے چہیتے کی آنکھوں سے آنسوؤں کے تار جاری ہو گئے۔ اس دن احمد کو بہت رنج ہوا تھا۔ بہت دیر کے بعد سمجھے تھے کہ است کے معنی کہنا بھول گئے ہیں۔

احمد کا بچپن ننھیال میں گذرا تھا۔ نانا کی مجلس میں شائستگی، سلیقے اور نفاست کی فراوانی تھی۔ احمد کے نانا کا معمول تھا کہ وہ دن کا کھانا محل سرا میں اور رات کا کھانا دیوان خانے میں کھاتے تھے۔ ایک وسیع ڈئننگ روم جسے اس زمانے میں نعمت خانہ کہتے تھے میں ایک بہت وسیع صاف و شفاف دسترخوان بچھتا تھا اور خواجہ فریدالدین احمد کے سارے بیٹے اور بیٹیاں، بیٹوں کی بیویاں، پوتے اور پوتیاں، نواسے اور نواسیاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ کوئی چیز دسترخوان پر گرنے نہ پائے، نہ انگلیوں کو کوئی چاٹے نہ روٹی کے ٹکڑے سے لتھڑا ہوا ہاتھ پونچھے نہ ہاتھ کھانے میں بھرنے پاویں نہ دسترخوان پر اپنی پلیٹوں کے سامنے چچوڑی ہوئی ہڈیاں رکھی جائیں نہ نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نکلے۔ سب بچے اپنے کپڑے صاف رکھتے تھے کہ کہیں نانا کی ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ یہاں تک کہ بہت سے بچے اپنے پیر بھی صاف رکھتے تھے کہ کہیں سفید فرش پر دھبہ نہ پڑ جائے۔

احمد کے نانا خواجہ فریدالدین احمد دوبار مغل حکومت کے وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ دوملکوں ایران اور برما میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے سفارتی خدمات انجام دے چکے تھے۔ دوبار کلکتہ مدرسہ کی نظامت کر چکے تھے۔ یہ مدرسہ ۱۷۸۰ء میں وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا۔ خواجہ فریدالدین کو ریاضیات سے طبعی مناسبت تھی۔ انھوں نے آصف الدولہ کے وزیر علامہ تفضل حسین سے لکھنؤ میں علم ریاضی کی تحصیل کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ فرید الدین مسلمانوں میں دوسرے اقلیدس تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولوی کرامت علی، خواجہ محمد ناصر اور حکیم رستم علی جیسے جید عالم اور فنکار تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ فرید کا علم وخبر میں کیا پایہ رہا ہوگا۔ ان کا علم کتابی نہ تھا، نہ اپنے زمانے سے وہ بے خبر تھے جس زمانے میں وہ کلکتہ میں تھے اس وقت یورپ سے تازہ تازہ چھاپہ خانہ آیا تھا۔ سیرام پور میں کتابیں چھپ رہی تھیں۔ راجہ رام موہن رائے اپنا اخبار مراۃ الاخبار نکالنے لگے تھے۔ کلکتہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہاں جو ذہنی بے داری رونما ہو رہی تھی اس کے اخذ و اکتساب میں سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد بھی شریک تھے۔ وہ غالب کے کلکتہ پہنچنے سے دس بارہ سال پہلے دس بارہ سال کلکتہ میں گذار کر دہلی آچکے تھے۔ خواجہ فریدالدین احمد کے پاس دہلی میں ایک بہت اچھا کتب خانہ تھا جس میں مشرقی علوم کی کتابوں کے علاوہ جدید انگریزی کتابیں بھی تھیں جن پر خواجہ فریدالدین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے معنی و مطلب بھی تھے۔ وہ انگریزی بول بھی لیتے تھے اور پڑھتے بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ایک یادداشت بھی لکھی تھی جو ۱۸۵۷ء کے غدر میں ضایع ہو گئی۔ یہ سرسید کی نظر سے گذری تھی۔

اُن دنوں دلی میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے تمام پرانے طریقے دودھ کے دھلے ہیں اور اتنے درست ہیں کہ ان کی پیروی ہمیں آنکھ بند کر کے کرنی چاہیے۔ کچھ لوگ دلی میں ایسے بھی پیدا ہو گئے تھے جو دلی میں تعینات ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسروں کی بغیر سوچے سمجھے نقل کرنا ہی اپنی شان سمجھتے تھے لیکن وہاں چند لوگ ایسے بھی تھے جو ہندوستان اور یورپ دونوں جگہ کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے۔ خواجہ فریدالدین انھیں لوگوں میں سے تھے۔ وہ صاحب علم وفکر تو تھے ہی ساتھ ہی تصوف کا رجحان بھی رکھتے تھے لیکن ان کا دل آئین جہاں بانی کو رقم کرنے میں زیادہ لگتا تھا۔ وہ جہاں دیدہ مدبر تھے۔ انھیں مغل حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کا اعتبار حاصل تھا۔ دلی کے دکھیارے بادشاہ کو تو ان پر اتنا بھروسہ تھا کہ ہر قلعہ معلّٰی کے مالی حالات کو تباہ کن خرابیوں سے بچانے کے لیے انھیں دوبارہ کلکتہ سے بلایا گیا۔ انھیں کے مشورے پر اکبر شاہ ثانی نے اپنے پنشن کے معاملات کو درست کرنے کے لیے راجہ رام موہن رائے کو لندن بھیجا تھا اور راجہ کا خطاب دیا تھا۔ احمد نے اپنے بچپن میں کئی بار راجہ رام موہن رائے کو لال قلعہ میں دیکھا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی خواجہ فرید پر اتنا اطمینان تھا کہ انھیں اس نے ایران اور برما صلح صفائی کے لیے اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ دلی کا ریزیڈنٹ جنرل آکٹرلونی جسے دہلی والے اختر لونی کہتے تھے اور مغل بادشاہ نے اسے نصیر الدولہ معز الملک وفادار خاں بہادر ظفر جنگ کا خطاب دیا تھا۔ وہ خواجہ فریدالدین کے یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ ان کے دیوان خانے میں جہاں فرش کی نشست تھی اور رومی مخمل اور زربفت کا مسند رکھا رہتا تھا، وہاں ایک کرسی شیر کے سے پایوں کی بھی رکھی تھی اور جب جنرل آکٹرلونی آتا تھا تو اس پر بیٹھتا تھا کہ کھیلتے ہوئے ایک دن ادھر احمد آنکلے اور جنرل کو دیکھ کر الٹے پاؤں واپس جانے لگے لیکن آکٹرلونی نے انھیں اپنے پاس بلا لیا، باتیں ہونے لگیں۔ احمد نے پوچھا آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دوہرے بٹن کیوں لگے ہوئے ہیں۔ دراصل بچپن ہی سے احمد کی افتادِ طبع کچھ ایسی تھی کہ ہر نئی چیز ان کے تجسس میں اضافہ کرتی۔ معلوم کرنے کی یہی خواہش تھی جس نے آگے چل کر علمی جستجو کو سرسید کے لیے ایک دائمی سفر بنا دیا۔

احمد ابھی تک دلی سے باہر نہیں گئے تھے۔ ایک دن ان کے والد نے مغل پورا اپنے گاؤں چلنے کے لیے کہا۔ احمد کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ جب وہ مغل پور پہنچے تو نیلے شفاف آسمان اور حد نظر تک سرسبز کھیتوں کی وسعتیں ان کا استقبال کر رہی تھیں۔ رہٹ چل رہے تھے۔ گڑ تیار ہونے کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ گاؤں جفاکش اور کھرے جاٹوں سے آباد تھا۔ یہاں کے قدرتی مناظر کھیت کھلیان شام کو چراگاہوں سے پلٹتے ریوڑ، مصفا تالاب، شاداب باغات احمد کو اچھے لگے تھے۔ وہ فصل کے موقع پر ایک ایک ہفتہ اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔ یہاں کی خوشگوار یادیں جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ دہی اور تازہ تازہ گھی اور باجرے اور مکئی کی گرم گرم روٹیوں کی یاد سرسید کو عمر کے آخری حصے میں بھی رہی۔ گاؤں میں رہنے کی وجہ سے وہ وہاں کی مشکلوں اور پریشانیوں کو بھی سمجھ گئے تھے۔ اسی لیے بڑے ہو کر سرسید کو زراعت کی ترقی سے بڑی دلچسپی ہو گئی تھی، انھیں گاؤں کی پیداوار بڑھانے کا بڑا خیال رہتا تھا۔ انھوں نے کاشتکاری کے پرانے طریقوں کو بدل کر نئے طریقے رائج کرنے کا کام علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ شروع کرایا۔ زراعت پر کتاب کا ترجمہ کرایا اور بھی چھوٹے بڑے ایسے کام کیے جس سے دیہات کے لوگوں کو بھی پیٹ بھر روٹی ملے۔ انھوں نے ایک ایسی نلکی بھی بنائی جس سے گیہوں کی پیداوار زیادہ ہو۔

احمد جیسے جیسے بڑے ہو رہے تھے انھیں حویلی کے اندر چین نہیں آتا تھا۔ انھیں مردانہ دلچسپیاں ہی نہیں خطرے کی زندگی پسند تھی۔

انھیں گھوڑے کی سواری اچھی لگتی تھی۔ اس زمانے میں دلی کے شرفا تیراندازی اور تیراکی میں کمال بہم پہنچانا جوہر شرافت جانتے تھے۔ احمد کے والد سید محمد متقی کو ان فنون میں کمال حاصل تھا۔ شرفائے دہلی کی بڑی تعداد ان فنون میں ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتی تھی۔ احمد نے بھی اپنے باپ کے ساتھ تیرنے کی کافی مشق بہم پہنچائی تھی۔ وہ دلی میں تیراکی کے مقابلوں میں شریک ہوتے۔ وہ پانی میں جس طرح جدوجہد کرکے آگے بڑھتے تھے اسی طرح بعد میں وہ ہر اس دریا کو پیر جاتے تھے جو ان کا راستہ روکتا تھا۔ بے خطا نشانہ لگانے میں بھی احمد کا جواب نہ تھا۔ ایک دفعہ جب احمد کا نشانہ تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو باپ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے۔

بچپن میں احمد کو کبھی کبھار بہت طیش آجاتا تھا۔ ایک بار وہ اپنے ساتھی کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے اس نے بے ایمانی کی۔ احمد کو بہت تاؤ آیا۔ وہ نہایت تیزی سے اٹھے اور اس کے ہاتھ پر اتنے زور سے مکا مارا کہ اس کا انگوٹھا اتر گیا۔ وہ بھونچکا ہو کر احمد کو دیکھنے لگا۔ اسے اپنے درد کا احساس ہوا، اتنے میں سارے دوست جمع ہوگئے۔ آخر کسی طرح معاملہ رفع دفع ہوا۔ اسی طرح ایک بار وہ اپنے ایک بوڑھے نوکر پر غضبناک ہوگئے اور اسے ایک تھپڑ رسید کردیا۔ احمد کی والدہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے ان کو گھر سے نکال دیا اور جب تک احمد نے نوکر سے معافی نہ مانگ لی انھیں گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی۔ لیکن احمد جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے وہ اپنے غصہ پر قابو پاتے گئے۔ یہاں تک کہ جب چاروں طرف سے ان کی تذلیل و تکفیر کی گھن گرج مچی تب بھی سرسید کے دل میں انتقام کا خیال نہ آیا۔ اس وقت تک عفو پروری اور درگذر ان کا شعار ہو چکا تھا۔

احمد خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہؐ سے ملتا ہے۔ یہی نہیں ان کے خاندان کو مغل دربار میں پشتینی رسوخ حاصل تھا۔ مغل اعظم شہنشاہ اکبر سے لے کر اکبر شاہ ثانی تک تقریباً تین سو برس کے عرصے میں مغل حکومت کو احمد کے خاندان سے لگاتار سپہ سالار مدبر شاعر اور عالم ملتے رہے۔ انھیں اسباب سے ان کا خاندان دلی کے چند ممتاز خاندانوں میں تھا۔ احمد کے والد مغل دربار کے راست باز اور کھرے امیروں میں تھے۔ انھیں بادشاہ بھائی کے لفظ سے مخاطب کرتا تھا اور وہ اس کی نشست گاہ تک بلا روک ٹوک کے جاسکتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے وہ اپنے پیر طریقت شاہ غلام علی مجددی کی مقناطیسی نظروں کے تار میں بندھتے گئے، ان کا دل دربار کے جھمیلوں سے بیزار ہوتا گیا اور دنیا کی دوستی سے ان کا دل پاک ہوتا گیا۔ انھوں نے مغل دربار کا جانا کم کردیا اور ان کی جگہ احمد دربار میں جانے لگے۔ وہ ابھی آٹھ نو برس کے تھے کہ شاہی جلوس کے موقع پر اس وقت پہنچے جب دربار برخاست ہو چکا تھا۔ بادشاہ محل میں جانے کے لیے ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے احمد کو گھوڑے پر آتے ہوئے دیکھا۔ بادشاہ جب تسبیح خانے کے پاس پہنچے تو ٹھہر گئے اور جواہر خانے کے داروغہ کو کشتی جواہر لانے کا حکم دیا اور احمد کو اپنے پاس بلایا۔ ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ دیر میں کیوں آئے، مگر احمد چپ کھڑے رہے۔ درباریوں نے کہا عرض کرو، تقصیر ہوئی، جب بادشاہ نے احمد سے دوبارہ پوچھا تو احمد نے کہا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا کہ بہت سویرے اٹھا کرو۔ احمد کے اس طرح سچ بولنے پر سارے درباری حیران ہوگئے تھے۔ یہی سچ بعد میں سرسید کی تقریر میں، تحریر میں، بات میں اور برتاؤ میں ان کی پہچان بن گیا۔

(یہاں جو واقعات پیش کیے گئے ہیں وہ حیات جاوید اور سیرت فریدیہ سے لیے گئے ہیں)

☆

تبصرہ

مدرسۃ العلوم: حقائق اور محرکات کے پس منظر میں

ابوالکلام قاسمی

سرسید کی درسگاہ کا سارا تناظر یا تو سرسید احمد خاں کی زندگی اور سوانح سے شروع ہو کر ان کی متعدد کاوشوں تک شماریات کی سطح پر سمٹ کر رہ جاتا ہے یا پھر معلوم حقائق کو نئے الفاظ اور نئے انداز سے پیش کر دینے تک محدود ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کی تحریک بالخصوص تعلیمی تحریک کی بنیاد نہایت منصوبہ بند اور تدریجی نوعیت کی تھی۔ اس کے دو پہلو بہت اہم تھے۔ ایک تو یہ کہ زبوں حال مسلمانوں کے طبقے کو اپنے تعلیمی اور سماجی تجدد سے مانوس کرنے کی خاطر پہلے مذہب اسلام کی وسعت اور فراخ دلی کا احساس دلانا اور سائنٹفک افکار سے اس کی ہم آہنگی کا ماحول تیار کرنا اور پھر اس کے بعد ابتدائی تعلیم اور نوخیز طلباء کی ذہنی نشوونما کو ایک خاص نہج پر مائل بہ ارتقاء کرنے کی خاطر مدرسۃ العلوم کے نام سے ایک اسکول یا مدرسے کی داغ بیل ڈالنا۔ اس مختصر سی تمہیدی اور تعارفی تحریر کا اصل مقصد اس طریق کار پر مبنی یونیورسٹی اسکول سے متعلق ایک اہم اور قابل توجہ کتاب کی قدر و قیمت کو سمجھنا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سرسید احمد خاں پر مبنی تقریباً ایک درجن کتابوں کی لگاتار تصنیف کے بعد پروفیسر افتخار عالم خاں کی بنیادی نوعیت کی یہ کتاب ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسکول کی تاریخ'' آپ کے پیش نظر ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی سے موسوم کتاب سے شروع ہونے والی افتخار عالم خاں صاحب کی علمی اور تاریخی تلاش و جستجو ایک بار پھر مطالعات سرسید کی ان مبادیات سے مربوط ہو گئی ہے جن میں آج کی عصری زبان میں ''علم ہی دراصل طاقت اور قوت کا سرچشمہ ہے'' کا اصل محرک کارفرما ہے۔ جس نکتے کو بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے اوائل میں عالمی سطح پر علم کو طاقت کا سرچشمہ قرار دینے کے نام سے عملی طور پر اپنانے اور برتنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس نکتے تک سرسید نے انیسویں صدی کے وسط میں رسائی حاصل کر لی تھی۔ سرسید کا ذہن اپنی کلیت میں امتزاجی بھی تھا اور صورت حال کے انتشار میں بھی اپنی قوت آخذہ کے طفیل نتائج اور اثرات کی نوعیت پر حاوی بھی۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے قیام اور اس کے لائحہ عمل کا خاکہ اصولی اور نظریاتی تفصیلات پر مبنی رکھنے پر اکتفا کیا تھا، جس کا عملی ثبوت محض دس سال کے عرصے میں اس طرح پیش کرنا شروع کر دیا تھا کہ پہلے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے انگریزی علوم بالخصوص سائنس کی کتابوں کے تراجم اور لیباریٹری میں زراعت اور روزمرہ کی دوسری تجرباتی کاوشیں روبہ عمل آئیں اور ۱۸۷۵ء آتے آتے مدرسۃ العلوم کا باقاعدہ قیام عمل میں آ گیا۔

گزشتہ تین چار برسوں میں مسلم یونیورسٹی اور سرسیدیات پر کثرت سے مضامین اور کتابوں کی اشاعت کے باوجود مدرسۃ العلوم کے قیام، کالج کی صورت میں اس کی ترقی اور پھر یونیورسٹی بننے تک اس کی انتظامی اور عملی تفصیلات کو سمجھنے میں عموماً لکھنے والوں نے خلط مبحث سے کام لیا ہے اور تاریخی یا زمانی ارتقاء کو پیش نظر نہ رکھنے کے باعث طرح طرح کی تعبیرات نے ان تمام معاملات کو خواب پریشاں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس بات کے بار بار اعادے کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود یہ کہے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ پروفیسر افتخار عالم خاں

نے آثار قدیمہ اور تاریخ کا عرفان رکھنے کا جو ثبوت اپنی تصانیف میں دیا ہے اس کی قدروقیمت میں روز بروز اضافہ ہوگا اور غائر اور طویل مدتی مطالعہ ہی اس نوع کی تصانیف کی صحت، اہمیت اور افادیت کا راز قاری پر پوری طرح منکشف کر پائے گا۔

سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کا جو عملی آغاز یونیورسٹی اسکول قائم کرکے کیا تھا اس کے محرکات وعوامل کے ساتھ ایک تعلیمی ادارے کے قیام کے ساتھ وابستہ مسائل مثلاً زمین کی فراہمی، عمارت کی تعمیر، اساتذہ اور طلبہ کی تعداد اور نوعیت اور طریقۂ تعلیم اور ذریعہ ترسیل جیسے بیش تر مسائل، یا یہ کہ اسکول کن مراحل سے گزر کر آج ہمارے سامنے ایس ٹی ہائی اسکول کی صورت میں موجود ہے؟ اس نوع کے سارے سوالات کے جواب تین ابواب (۱) عام تعلیم کی تمہید، (۲) ابتدائی مراحل اور تاسیس اور (۳) نشیب وفراز اور دوامی بندوبست میں تفصیل سے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصنف نے پہلے باب میں زیر بحث کتاب کو محض تاریخ نویسی سے بلند کرکے فلسفیانہ اور نظریاتی مباحث تک لے جانے کی طرف توجہ صرف کی ہے۔ مشرق ومغرب میں علم کا کیا تصور رہا ہے اور علم اپنی ماہیت کے اعتبار سے کتنی گہری معنویت کا حامل ہے، پھر یہ کہ علم اور تعلیم یا تدریس میں تفریق کیوں کر کی جاسکتی ہے اور علم اور ہنرمندی کے ڈانڈے کہاں کہاں ملتے ہیں اور کیوں کر دونوں الگ الگ جہات کی طرف مڑ جاتے ہیں؟ یہ وہ بنیادی یا نظریاتی سوالات ہیں جن کا سامنا کیے بغیر محض رسمی طور پر اسکول یا کالج کی بنیاد یا روایتی نوعیت کے تعلیم وتعلم تک افتخار عالم خاں جیسا کوئی دانشور محقق اپنی کتاب میں اصولی، نظریاتی اور فلسفیانہ جہت کا اضافہ نہیں کرسکتا تھا۔ انھوں نے اس ضمن میں ازمنۂ قدیم میں علم اور تعلیم کی بحث اٹھائی ہے اور ہنرمندی سے اس کا رشتہ بھی جوڑ کر دیکھا ہے۔ اس کے بعد کے حصے میں ازمنۂ وسطیٰ میں تعلیمی تصورات کے ساتھ نوآبادیاتی عہد میں انگریزوں کی آمد کے بعد تعلیمی اور تدریسی اداروں کی نوعیت مکتبوں، مٹھوں، مذہبی عبادت گاہوں اور محدود نقطہ نظر سے بلند ہوکر اس نوع کے اداروں کا فلاحی، جمہوری اور عوامی تحریک میں تبدیل ہونے کا جائزہ یا انگریزوں کے ذریعہ تدریس وتراجم کے لیے قائم کیے گئے اداروں اور اسکولوں اور کالجوں کو ایک علمی تحریک میں تبدیل کردینے کی صورت میں علمی سرگرمی جو روبہ عمل آنا شروع ہوئی، ان تمام مسائل کو افتخار عالم خاں صاحب نے یونیورسٹی اسکول کی تاریخ کے پس منظر میں شامل کرلیا ہے اور سرسید کی مساعی کی معنویت کا ایک گہرا نقش مرتسم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید برآں یہ کہ اسکول میں جس طرح اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے پر سرسید احمد خاں نے زور دیا تھا اور اسی اعتبار سے تدریس کی منصوبہ بندی کی تھی، اس کے برخلاف قدرے بعد کے زمانے میں انھوں نے اپنی اس رائے پر اصرار چھوڑ دیا اور مصلحت کے تقاضوں کے تحت انگریزی میڈیم کی ہم نوائی میں بھی انھیں کوئی تکلف محسوس نہیں ہوا۔ اس نوع کے رویوں سے سرسید احمد خاں کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف نے اس نوع کے نکات پر پوری کتاب میں توجہ صرف کرکے کتاب کو مزید بامعنی بنادیا ہے۔

لیکن آج کی صورت حال میں کیا اس بات کی ضرورت نہیں کہ سرسید علیہ الرحمہ کے اس نوع کے منصوبوں کو، ان کی اصل صورت میں بھی اور ضمنی طور پر متروک منصوبوں کے احیا کی شکل میں آج کے سیاق وسباق میں رکھ کر بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ شاید یہ کام بھی افتخار عالم خاں سے بہتر کوئی دوسرا شخص انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سرسید کے سماجی، ثقافتی، لسانی اور تعلیمی نظریات اور تصورات کو زندہ کرنے یا پوری طرح سے ان سے دست بردار ہونے کے پس منظر میں غور وفکر کا ایک منظم سلسلہ شروع ہونا چاہیے۔ مگر اس کی توقع سرسید اور علی گڑھ تحریک سے مجاورانہ عقیدت رکھنے والوں سے مشکل سے ہی کی جاسکتی ہے۔ چونکہ افتخار عالم خاں نے یہ کام بحسن خوبی انجام دیا ہے اس لئے یونیورسٹی کے سنگ بنیاد کو جو اسکول یا مدرسۃ العلوم کی صورت میں قائم ہوا تھا اس کی نوعیت، اغراض ومقاصد اور دوررس اثرات کی بازیافت کا سلسلہ دراز ہوتا رہے۔

E-mail: amjadaliq@yahoo.com
ulamu@amu.ac.in
Phone { Off 0571-2700512
Exch 0571-2700920, 21, 22
Mobile +91 9045340691

MAULANA AZAD LIBRARY

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH – 202002 (U.P.) INDIA

Dr. Amjad Ali
Ph.D., D.Litt. (LIS)
University Librarian

D.No. 931/MAL
Dated: 21-9-19

محترم مدیر: فکر و نظر علی گڑھ

فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری پر تعارف و تجزیہ

فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری پر تعارف و تجزیہ ڈاکٹر عطا خورشید کا پڑھا کافی معلوماتی تجزیہ ہے۔ تجزیہ کم ہے تاریخ مخطوطات اور تاریخ لائبریری زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس تجزیہ میں آرزو صاحب پر قصیدہ اور خود موصوف نے اپنے اوپر قصیدہ خوانی کی ہے۔ موصوف کی نظر میں خود سے اچھا کیٹالوگر اور خود سے اچھا مخطوطات کی فہرست بنانے والا کوئی اللہ نے ان کا ثانی پیدا نہیں کیا ہے۔

موصوف کو غلطیاں اس لیئے نظر آئیں کہ اس میں سابق انچارج مخطوطات کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ ان کو چھپنے سے پہلے دکھایا گیا۔ اور نہ ہی ان سے مدد لی گئی۔ اس لیئے یہ تعارفی تجزیہ کم اور تنقیدی تجزیہ زیادہ ہے۔ اس کا نام موصوف کو تعارف و تجزیہ نہ رکھ کر تنقیدی تجزیہ رکھنا چاہیے تھا۔

یہ بات ان کی اپنی جگہ صحیح ہے کہ اس میں غلطی ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے تھا کہ پرنٹنگ مسٹیک بہت ہے وہ اس وجہ سے ہوئی کہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے بہت سے الفاظ اردو کے کمپیوٹر کسی اندر کی وجہ سے نہیں لے پاتا۔ کیونکہ کمپیوٹر ایجاد کرنے والا شخص انگریز تھا۔ اردو کی ایم اے، پی ایچ ڈی نہیں تھا۔

تبصرہ نگار نے جن کتابوں کا حوالہ دیا کہ وائس چانسلر نے یونیورسٹی کے پروفیسروں کی کتابیں واپس کرنے کا حکم جاری کیا وہ اصل میں مشہور مصنف اور شاعروں کی کتابیں تھیں ان کی دوسری کتابیں جو صحیح تھیں وہ پہلے سے موجود تھیں اور ان حضرات کی کتابیں غلط اردو وہاں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں ان کی مثال دینا موصوف کی کم ظرفی کہنا مناسب ہوگا۔

فہرست کو لائبریری کے اصول کے مطابق مرتب کیا گیا ہے جس کو دستی فہرست کہتے ہیں۔ یہ فہرست اچھی تھی اس لیئے پروفیسر
عزیزالدین، پروفیسر اصغر عباس نے حرف چند لکھنا مناسب سمجھا ورنہ اتنے مشہور اور جدید پروفیسر
اس پر ذرا بھی تبصرہ نہیں کرتے۔

موصوف نے بہت سی غلطیوں کو اجاگر کیا ہے، ایک دو مثال کے طور پر کہتا چلوں مثلاً: سلایاں و ابسال کی جگہ سلامان و ابسال ہونا چاہیے تھا سبحان اللہ کیٹلاگ میں وہ ہی ہے جو فہرست مخطوطات میں لکھا ہے۔ بحر الجواہر کو موصوف کہہ رہے ہیں کہ پورا عنوان ہونا چاہیے۔ جگہ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اس کو مختصر لکھنا ہی لائبریری کا اصول اور کیٹلاگ کا اصول کہنا مناسب ہوگا۔

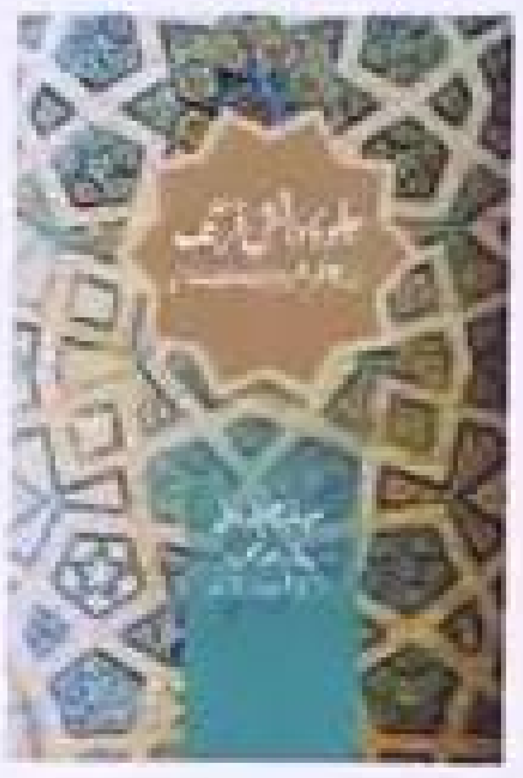
(دستخط)
امجد علی

پुस्तकालयाध्यक्ष/University Librarian
मौलाना आज़ाद लाइब्रेरी/Maulana Azad Library
अ०मु०वि०, अलीगढ़/A.M.U., Aligarh

نوٹ: یہ مراسلہ من وعن مراسلہ نگار کا ارسال کردہ ہے، جس میں زبان و بیان کی ساری اغلاط اور نازیبا الفاظ کے استعمال کی ذمہ داری خود مراسلہ نگار کی ہے۔ ادارہ اس مسئلہ کو مزید طول نہیں دے سکتا اس لیے آگے کی کسی رائے کے لیے معذرت۔

براؤن بک پبلی کیشنز کی چند اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	قیمت
1	افسانے کا منظر نامہ	مرزا حامد بیگ	₹ 300
2	اردو افسانے میں ہندوستانی معاشرہ	گلرخ زہین	₹ 500
3	جدید اردو افسانہ	طارق چھتاری	₹ 300
4	دلی کی خواتین فکشن نگار	نشاں زیدی	₹ 300
5	یادیں	اسد محمد خاں	₹ 400
6	اردو افسانوں کے مہاجر کردار	عائشہ شفیق	₹ 500
7	ابوالفضل صدیقی: حیات وخدمات	سید ظفر امام	₹ 300
8	اردو میں تدوین	محمد انصاراللہ	₹ 300
9	اردو میں علمی نثر	منور حسین	₹ 500
10	خلیل الرحمن اعظمی کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	ثمرین جہاں	₹ 500
11	کلام اقبال کے اشخاص واصنام	محمد نہال الدین	₹ 700
12	سوانح سرسید: ایک بازدید	شافع قدوائی	₹ 350
13	جہاتِ سرسید	شمس بدایونی	₹ 250
14	شعرائے اردو کے تذکرے	عبدالرزاق	₹ 300
15	فرائڈی تناظر	تہذیب صدیقی	₹ 199
16	ادب اور نفسیاتی تنقید	خورشید سمیع	₹ 500
17	اردو کا عالمی تناظر	خواجہ اکرام الدین	₹ 500
18	اردو اور ہندی افسانوں میں عورت کا تصور	محمد شکیل خاں	₹ 500
19	اردو نصاب اور مدارس	توقیر راہی	₹ 399
20	اردو نظم میں فطرت کی پیش کش	زینت جبیں	₹ 795
21	تخلیقی فنکار: انیس رفیع کی تنقیدی بصیرتیں	صبا نوشاد	₹ 300
22	بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر	فرحت جہاں	₹ 450
23	تاج خلیج کویت کا عربی ادب	شفیع احمد ہاشمی	₹ 400
24	تاریخ زبان وادب اردو (حصہ اول)	محمد انصاراللہ	₹ 500
25	تاریخ زبان وادب اردو (حصہ دوم)	محمد انصاراللہ	₹ 500
26	تانیثیت اور اردو ادب	سیما صغیر	₹ 300
27	تتمہ تحفہ عربیہ	عطا خورشید	₹ 300
28	تصاویر علی گڑھ	ابوسفیان اصلاحی	₹ 400
29	تفہیم سودا	علی عمران عثمانی	₹ 650
30	تنقید اور ادب	حنا افشاں	₹ 500
31	جدید اردو شاعری کی جمالیات	رشید اشرف خاں	₹ 250
32	جدید قاہرہ	محمد اسلم اصلاحی	₹ 250
33	جمالیات اور اردو شاعری	قاضی جمال حسین	₹ 500
34	چہرہ بہ چہرہ روبرو	اطہر پرویز	₹ 300
35	دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو (جلد اول)	ریشماں پروین	₹ 500
36	دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو (جلد دوم)	ریشماں پروین	₹ 700
37	مخدوم محی الدین کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	نوشاد احمد سنجری	₹ 400
38	شب نشیں	شاہین	₹ 200
39	عشق کے سوا	جمال اویسی	₹ 400
40	غبار کارواں	شائستہ نگیں	₹ 500
41	کاشف الحقائق	خالد حیدر	₹ 500
42	کارگہہ کوزہ گراں	عقیل احمد	₹ 500
43	کلاسیکی تصور شعر کی روایت	آفتاب عالم عارفی	₹ 400
44	کثرت تعبیر	ابوالکلام قاسمی	₹ 300
45	نفسیاتی زاویہ نظر اور ادب	تہذیب صدیقی	₹ 450
46	یادیں	اسد محمد خاں	₹ 400
47	ہندوستانی مسلمان: مسائل وامکانات	محمد سجاد	₹ 350
48	اردو نظموں کا احتجاجی آہنگ	شہزاد انجم برہانی	₹ 350
49	احسان اللہ عباسی: حیات اور کارنامے	فیروز احمد	₹ 300
50	کتاب حکمت	ابوسفیان / پرویز عالم	₹ 400
51	ندوی فضلاء کی قرآنی خدمات	محمد طارق ایوبی ندوی	₹ 300
52	اہل حدیث فضلاء کی قرآنی خدمات	رفیق احمد رئیس سلفی	₹ 400
53	جماعت اسلامی کے فضلاء کی قرآنی خدمات	ضیاء الدین فلاحی	₹ 350
54	مدرسۃ الاصلاح کے فضلاء کی قرآنی خدمات	ابوسفیان اصلاحی	₹ 400
55	شیعہ فضلاء کی قرآنی خدمات	رضا عباس	₹ 200
56	اردو ناول: تعریف تاریخ اور تجزیہ	صغیر افراہیم	₹ 500
57	تحقیقات	فیروز احمد	₹ 500
58	نقد ونظر (تنقیدی مضامین)	جمال اُویسی	₹ 500
59	نقش گریز (نظمیں ۱۹۷۸ تا ۲۰۱۶ء)	جمال اُویسی	₹1195
60	رسمیات مقالہ نگاری	معین الدین عقیل	₹ 95



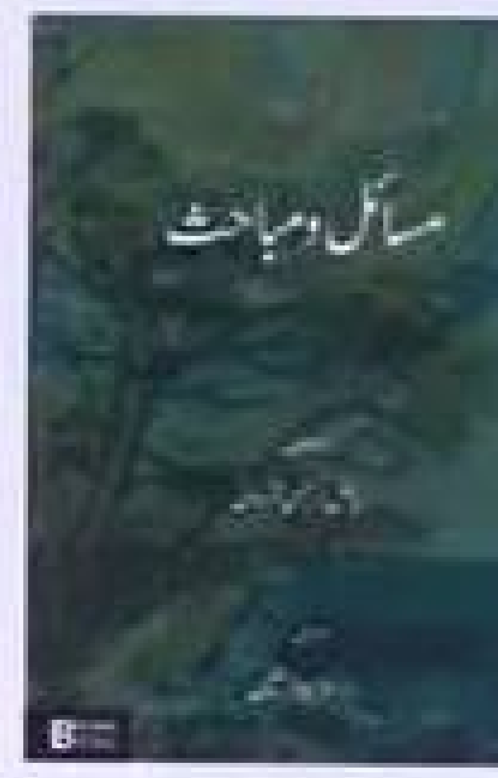
₹ 350/-



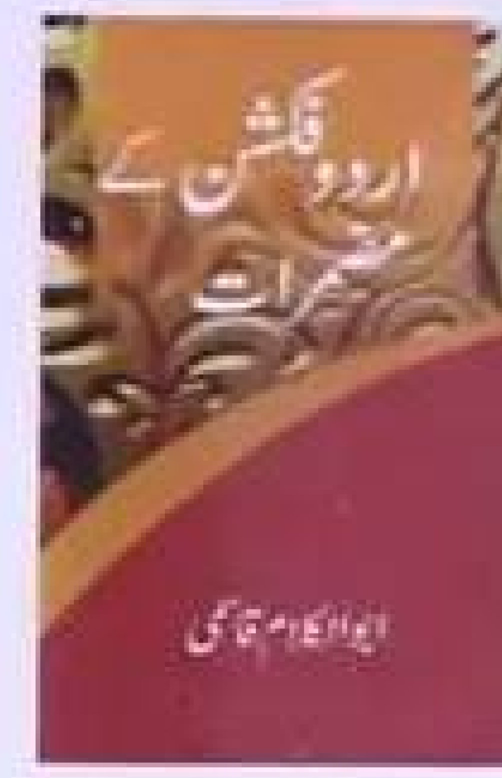
₹ 600/-



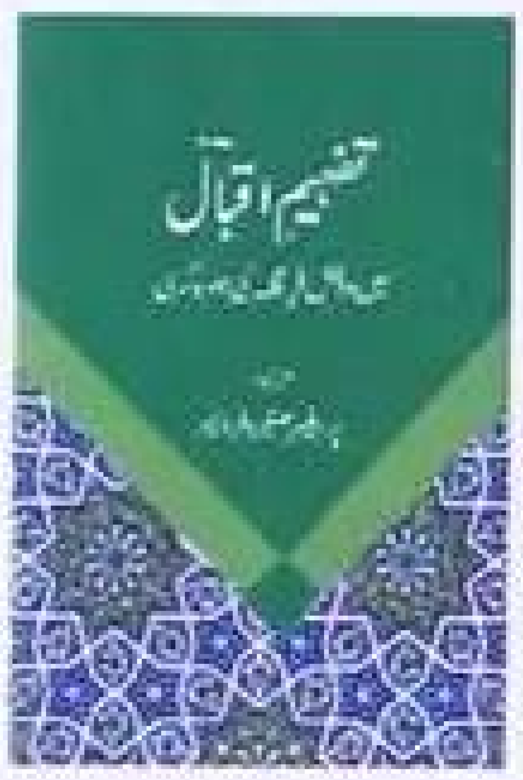
₹ 500/-



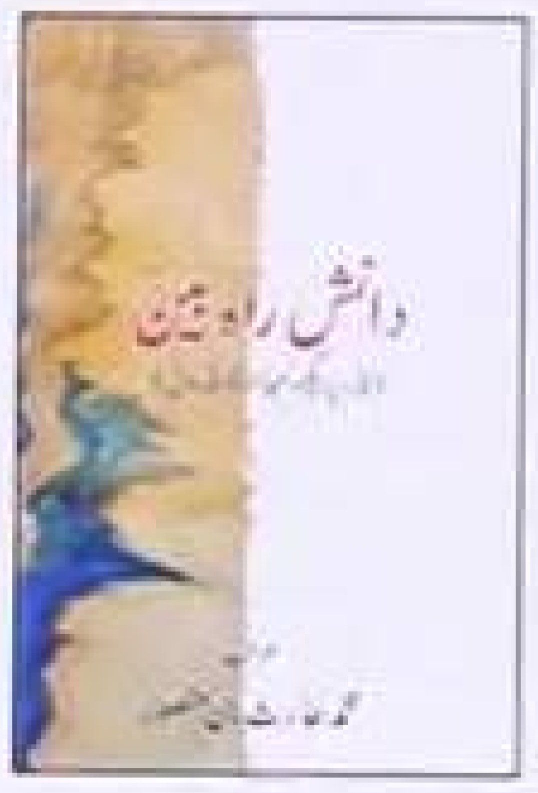
₹ 500/-



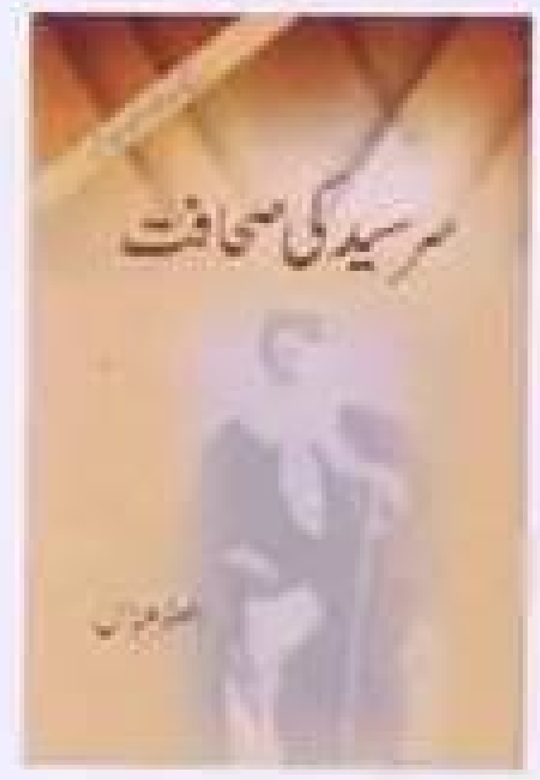
₹ 500/-



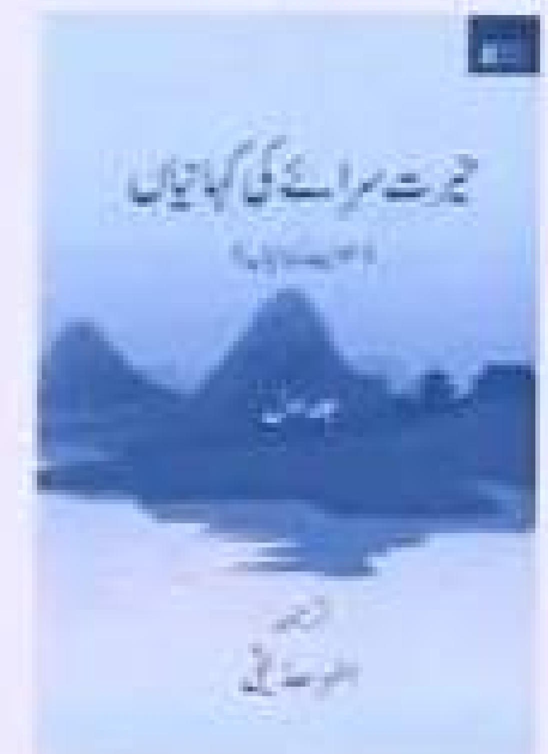
₹ 300/-



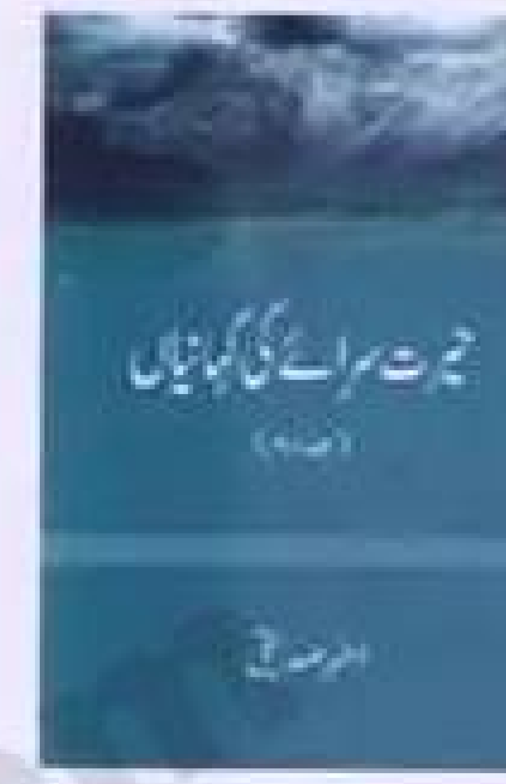
₹ 500/-



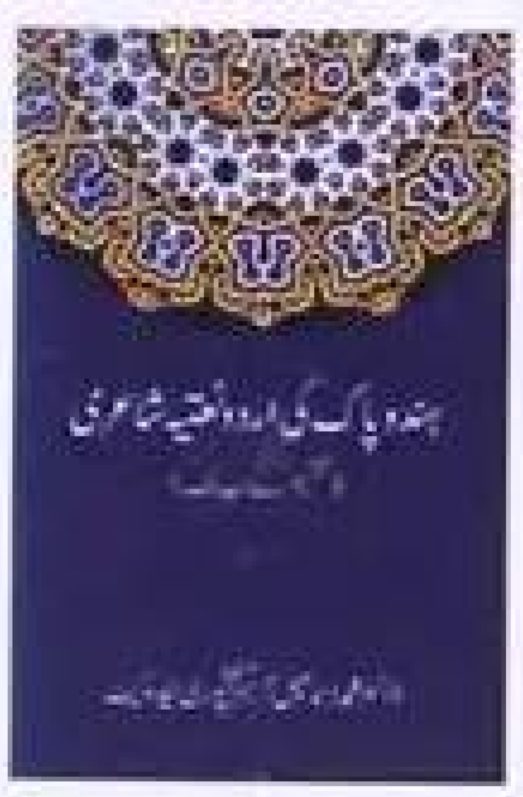
₹ 500/-



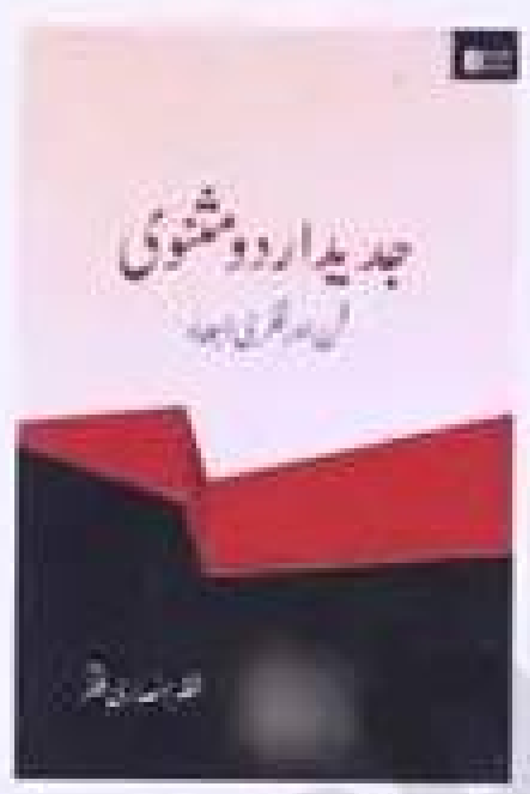
₹ 400/-



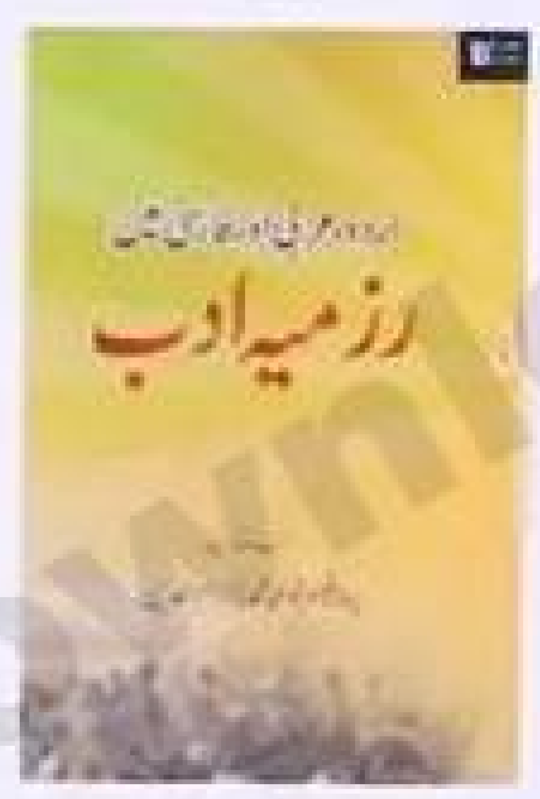
₹ 450/-



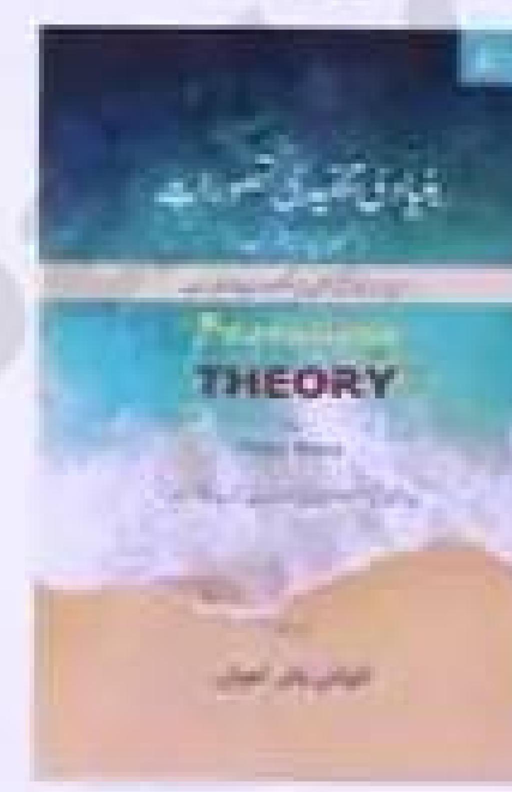
₹ 777/-



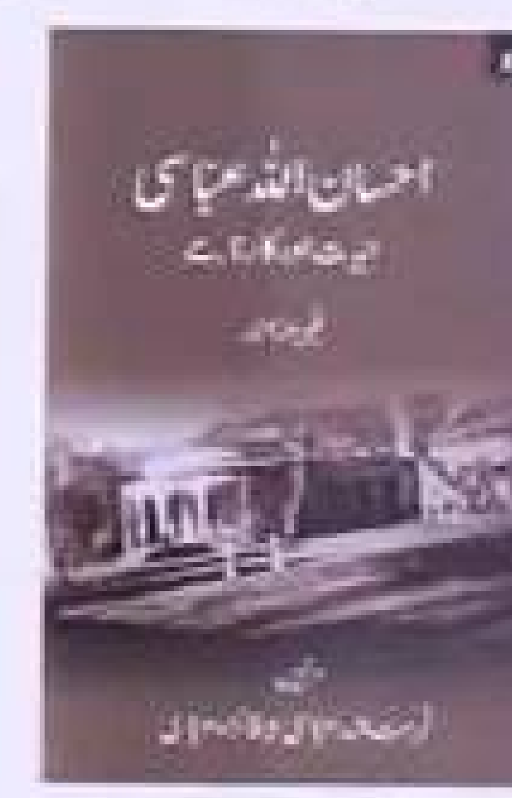
₹ 700/-



₹ 700/-



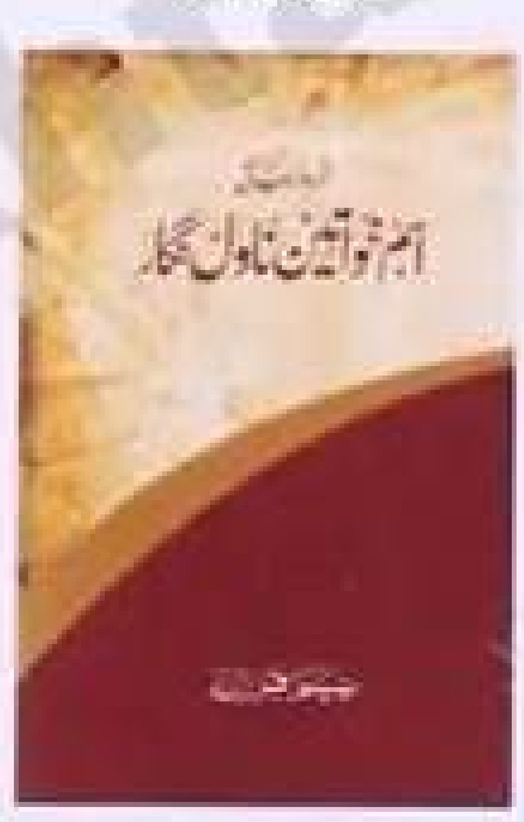
₹ 650/-



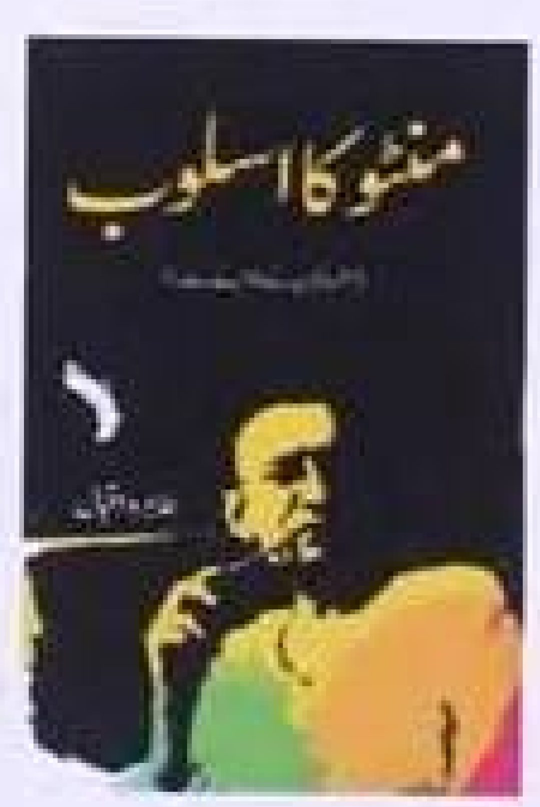
₹ 300/-



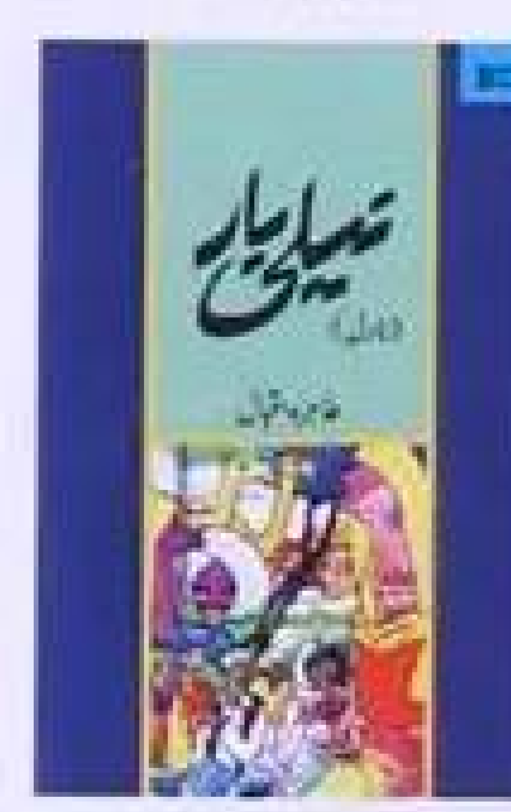
₹ 500/-



₹ 600/-



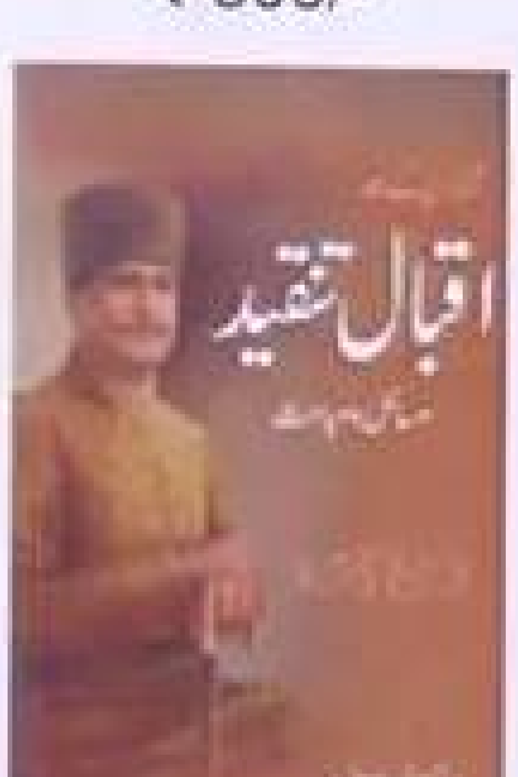
₹ 600/-



₹ 795/-



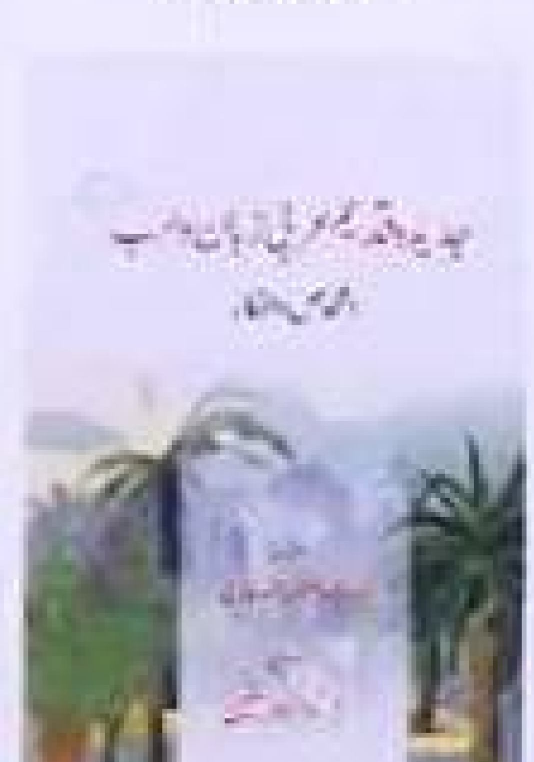
₹ 1000/-



₹ 600/-



₹ 700/-



₹ 600/-



₹ 500/-



₹ 500/-

BROWN BOOK PUBLICATIONS PVT. LTD., ALIGARH

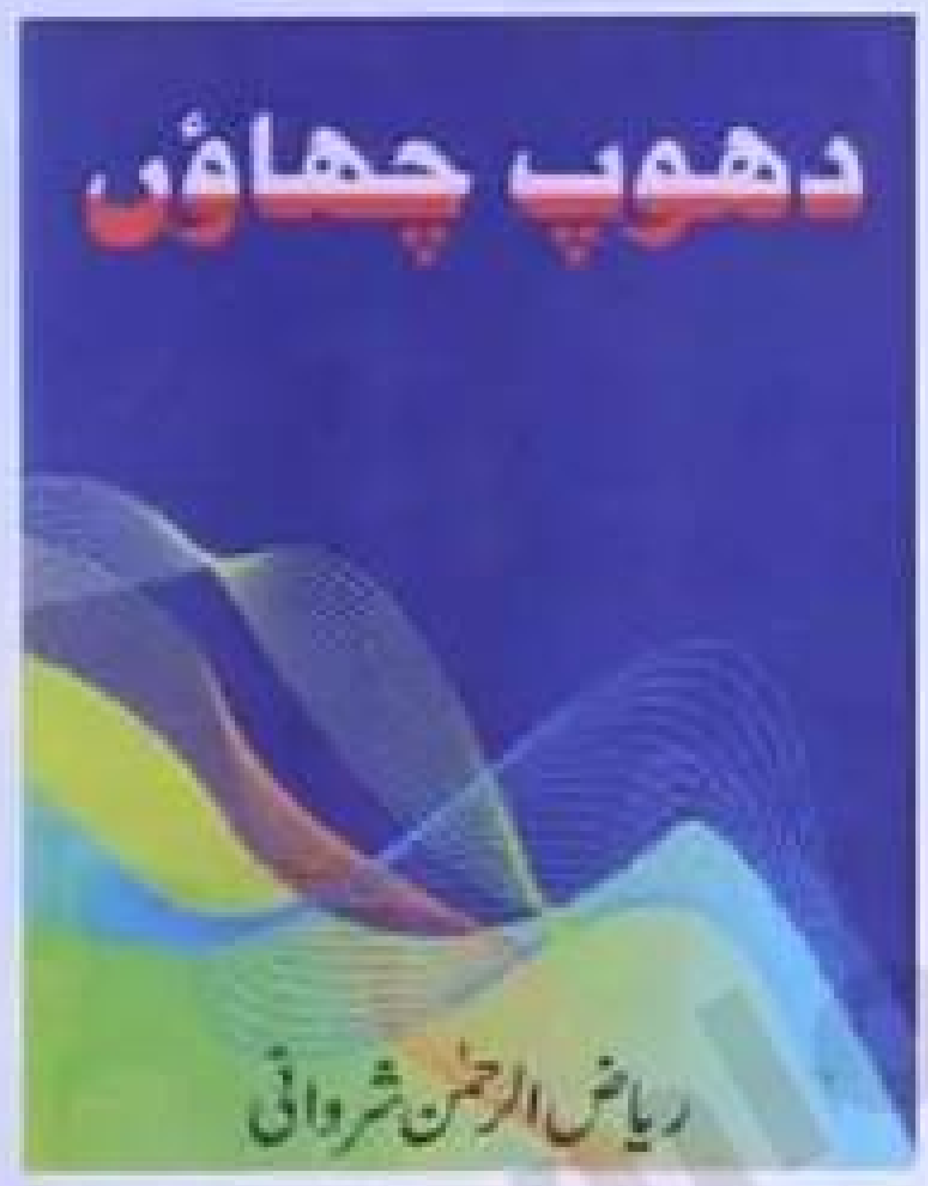
Monthly **FIKR-E-NAU** Aligarh

October 2019

تصانیف پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی



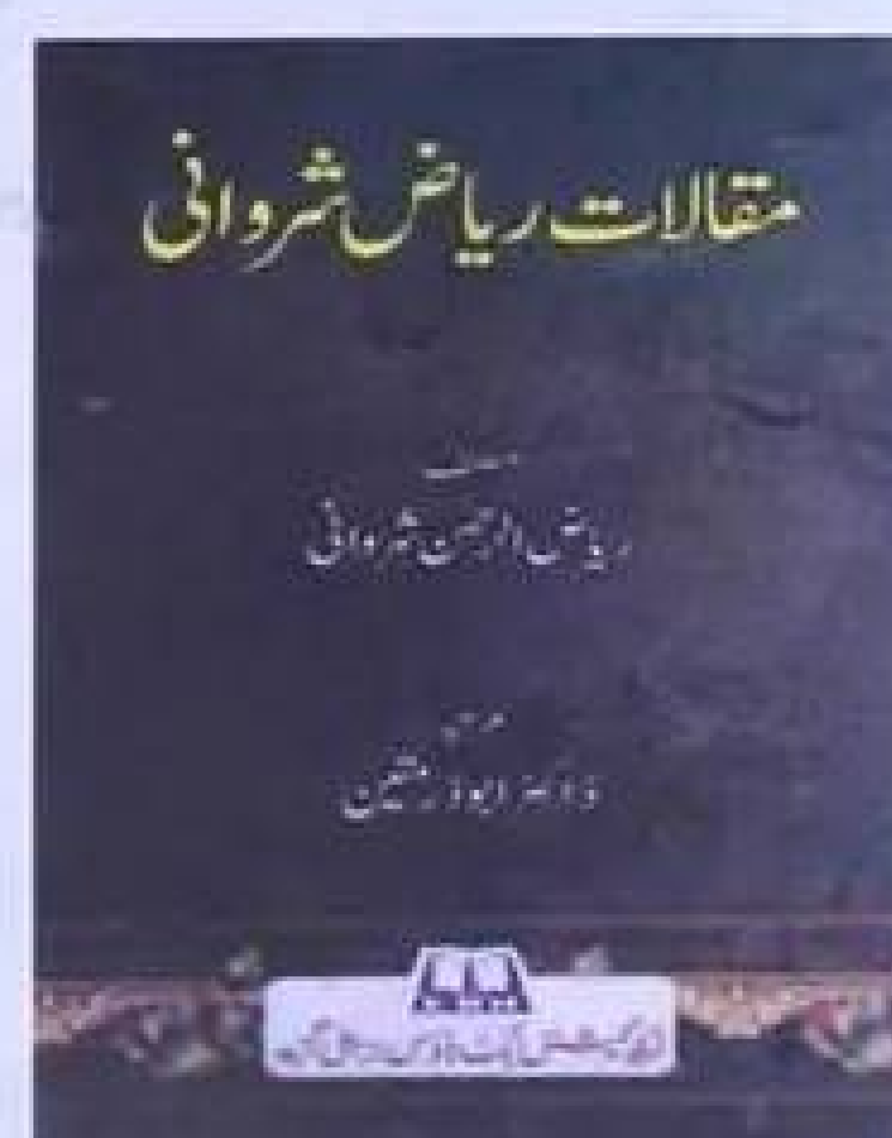
₹ 40/-



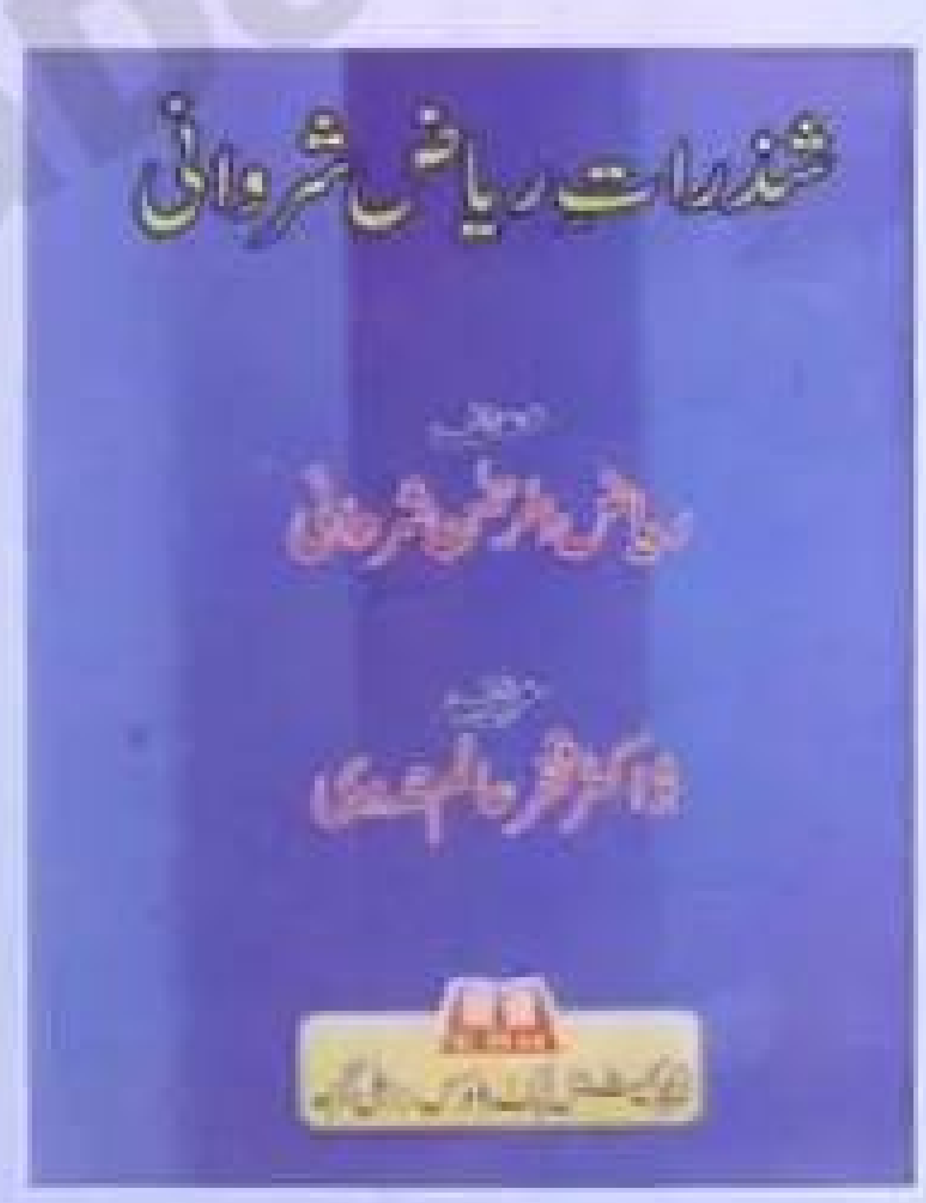
₹ 200/-



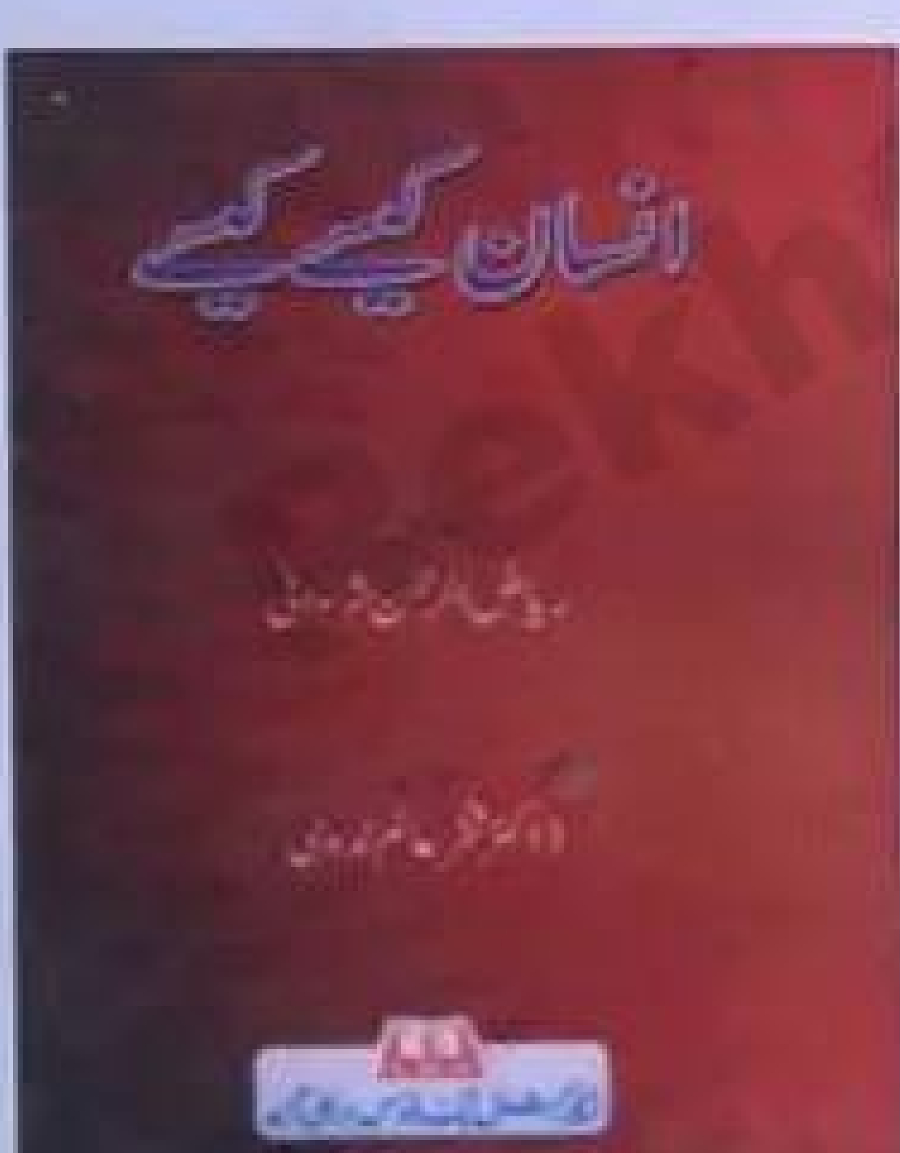
₹ 500/-



₹ 400/-



₹ 350/-



₹ 300/-

ملنے کا پتہ:

BROWN BOOKS

Opposite Blind School, Qila Road,
Shamshad Market, Aligarh-202001
Mob: +91-9818897975, Ph:0571 2700088
E-mail: bbpublication@gmail.com
Website: www.brownbooks.in